آنندی



غلام عباس

۳.۲۵

آنندی

غلام عباس

آنندی

مکتبۂ جدید - لاہور

پبلشر و پرنٹر

رشید احمد چودھری، مکتبۂ جدید پریس، لاہور

طبع جدید

۱۹۶۸ ع

ترتیب

جواری ،	۹
ہمسائے ،	۲۴
کتبہ ،	۳۹
حمام میں ،	۵۱
ناک کاٹنے والے ،	۱۰۲
چسکہ ،	۱۱۹
اندھیرے میں ،	۱۲۷
سمجھوتہ ،	۱۴۲
سیاہ و سفید ،	۱۵۵
آنندی ،	۱۷۰

یہ افسانے میں نے دلّی میں سنہ ۱۹۳۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تک مختلف وقتوں میں لکھے۔ اس لحاظ سے یہ میرے دلّی کے قیام کی یادگار ہیں۔ اور ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی افسانوں کا تمدنی اور جغرافیائی پس منظر بھی دلّی ہی ہے۔

اگرچہ میں نے سنہ ۱۹۳۹ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے تھے۔ مگر اس مجموعہ کی مندرجہ بالا خصوصیت کے پیشِ نظر ان کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

غلام عباس

جواری

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکا تھا اور پھر جاتا بھی تو کہاں، بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی، اگر کوئی منچلا جان کی پروا نہ کر کے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اوّل تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ رہتے اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آتی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا کیونکہ پولیس کے نصف درجن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے تھے ـــــ اور یوں وہ سب کے سب جواری، جن کی تعداد دس تھی، پکڑ لئے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے۔ ایک ٹھیکہ دار تھا۔ ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار۔ ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑ لیے گئے تھے۔ ان میں ایک تو من سکھ پنواڑی تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی کے پتوں پر نظر پڑ گئی۔ پتے غیر معمولی طور پر اچھے تھے۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے یہ ذرا کی ذرا

رکا تھا کہ اتنے میں پولیس آگئی - بس پھر کہاں جا سکتا تھا!

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا جو ٹھیکہ دار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکہ دار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکہ دار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلا دیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکہ دار کی تلاش میں سرگرداں تھا اور آخر ملا بھی تو کہاں، جہاں نہ تو ٹھیکہ دار کو کھیل سے فرصت تھی اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکہ دار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لیے تھم جائے اور دوسرے سب لوگ اُٹھ کر باہر چلے جائیں - مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی - ادھر ٹھیکہ دار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے چلا جا رہا تھا - آخر وثیقہ نویس مایوس ہو کر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آگئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کیے مگر پولیس نے ایک نہ سنی - باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پہلے سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا، پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انہیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا - دھندلکے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے جہاں تھانے دار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی یکسوئی میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا بھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے مڈبھیڑ کا خوف بھی نہ رہا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو ان سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص اسا کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا۔ چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط کو کام میں لاتا، مکان سرائے نہ بنا لیتا کہ ہرا ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آرہا ہے، بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا، نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوش گوار رکھتا تو ان لوگوں پر یہ بُرا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے "ننکو ننکو" کہا کرتے تھے۔ یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سُرمے کے ڈورے۔ سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ، دانت پانوں کے کثرتِ استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہوگئے تھے۔ گھنگھریلے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی۔ دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے۔ ململ کا کُرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ، سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس کا کُرتا ہمیشہ اُجلا ہوتا مگر دھوتی عموماً میلی۔ سردیوں میں اس لباس پہ ایک بڑا سا سُرخ دوشالہ زری کے حاشیے والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھُرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹتا اور بانٹ لیتا تھا۔

ننکو پہلے ہی اس حملے کے لیے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت

تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا۔ مگر اب جب کہ سب طرف سے اس پر تیز تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ جس میں خفیف سی شوخی بھی ملی ہوئی تھی، اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے لہجہ میں کہا۔

"آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو، کیا کہنا چاہیے، مذاق سمجھو مذاق۔"

جواریوں نے نکو کی اس بات کو سنا پر اس سے ان کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ بعض نے گردن ہلائی، بعض نے بازو جھٹک دیے۔

"ہوں۔ مذاق سمجھیں۔ یہ اچھی رہی!" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ" چمڑے کے سوداگر نے ذرا چمک کر کہا۔ "عجیب آدمی ہو یار۔ یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اسے مذاق بتا رہے ہو!"

"ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی۔ میں نے جو کہا، آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے نکلوگے مونچھوں پر تاؤ دیتے!"

"چل ہٹ لپاڑیا کہیں کا۔" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لپاڑیا کون۔ میں؟" نکو نے تنک کر کہا۔ "خیر جو جی میں آئے کہہ لو۔ مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر آنچ تک نہ آئے گی۔"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت

تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی، بچوں کو لے کر میکے جاتی تو اسے اس بیٹھک ہی کی سوجھتی۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھا دہیں کا رُخ کیا کرتا۔ ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا، عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔ مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔ اس شخص نے نکو کی یہ بات سنی ان سنی کرکے فریاد کے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"ارے بھائی میں لٹ گیا، میں سرکاری آدمی، میری عزت دو کوڑی کی ہو گئی۔ ہائے میرے بیوی بچے، نکو نے مجھے برباد کر دیا، ہائے ــــــ"

"سنو تو سہی ملک صاحب ــــــ"

"ارے کیا خاک سنوں، ہائے وہ کونسا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی، ارے یار میں سرکاری ملازم۔ اگر میرے دفتر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی ــــــ ارے بدنامی کو تو گولی مارو، یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں، ہائے میرے بیوی بچے ــــــ"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا اب تک تو بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ مگر ملک کا یہ واویلا سن کر کبھیا رگی دھاریں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو۔" نکو نے کہا۔ "تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد بنو۔ ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے۔"

"میرے پتا جی کو پتا چل گیا۔" مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کے کہا۔ "تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دیں گے۔"

"ارے یار چھوڑ بھی، کوئی گھر سے نہ نکالے گا۔" نکو نے کہا۔

"نکو۔" ملک نے کہا۔ "یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔"

"ملک صاحب۔" نکو نے پُر زور لہجہ میں کہا "آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ میری بات مانیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہ آئے گی۔ یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں۔"

"بس رہنے دے بھائی۔" ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا "اگر یہی دَم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا!"

"ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ بات اصل میں یوں ہے کہ تھانے دار اپنا ہی آدمی ہے۔ سمجھے آپ، وہ میرا بڑا مہربان ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہا۔"

نکو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی بات پر یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں نکو پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اترتا جا رہا تھا۔

"دیکھو نکو۔" چمڑے والے شیخ جی نے کہا "میں سو پچاس کی پروا نہیں کرتا، اگر میری عزت بچ جائے۔ ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں خود میرا بہنوئی سب انسپکٹر پولیس ہے مگر تو بہ تو بہ یہ کسی سے کہنے والی بات ہے!"

"شیخ جی آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ اسے آپ مذاق ہی سمجھیں۔ کبھی کبھی دل لگی کر لیا کرتا ہے میرا یار۔"

"کون؟" من سکھ پنواڑی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا ساتھی دیکھ کر اپنا دکھڑا بھول گیا تھا۔

"اجی بس آپ کے تماشے دار صاحب بہادر" یہ کہہ کر نکو ہنس پڑا۔

وہ جواری جو لاری چلاتا تھا کونے میں کھڑا کچھ دیر نکو کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا:

"دیکھو نکو! مجھے صبح سویرے لاری میں خشک میوہ بھر کے دورے جانا ہے ٹھیکیدار میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر تیری واقعی یہاں کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں۔"

یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نکو سے خطاب کیا اس نے قطعی طور پر نکو کے ساتھیوں میں اس کا اقتدار قائم کر دیا۔ نکو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیٰحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لئے جو سفارش کی تھی اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

نکو نے جس کے لہجہ میں اب اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی، لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا:

"مرزا جی، میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

"انتظام ونتظام خاک نہیں ہوگا۔" اچانک وثیقہ نویس نے جھلا کر کہا۔ "مرزا تم بھی اس ڈھینگئے کی باتوں میں آگئے۔ جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو۔"

نکو نے وثیقہ نویس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابک دستی سے روکا۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"لو بڑے میاں کی بات سنو!" اس نے کہا "ہوں، انتظام نہیں ہو گا اور یہاں مال جو کھلایا جاتا ہے ہر مہینے۔ بھایو میں پھر کہتا ہوں کہ اسے مذاق ہی سمجھو۔ میں ہندو مسلمان والی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔ وہ یوں کہ تھانیدار ——— اب کیا بتاؤں تمہیں،" وہ ہنس پڑا "کہہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے ——— اب تم کھول کے ہی رہو گے۔ پر ذکر وکر نہ کر بیٹھنا کسی سے ورنہ پھنس جاؤ گے۔ میرا دوش نہیں ہو گا۔ وہ بات یوں ہے کہ تھانے دار ——— اب تم سے کیا چھپانا ——— بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا! کیوں بڑے میاں اب تو ہو گئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دھندا بھلا کیسے چلتا رہتا۔"

نکو نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چلی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بُشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ وہ اٹھائیس برس کا ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہار دی تھی۔ بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنا لیا کرتا۔ چالیں تک سوچ رکھتا۔ بے حد احتیاط سے کھیلتا۔ نہ تاؤ کھاتا، نہ جوش میں آتا۔ مگر بدقسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رسوائی یا قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا۔ البتہ اس بات کی فکر ضرور

تھی کہ یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں۔ بچ گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا رُخ نہ کریں گے۔

ادھر نکّو نے اب حالات پر پورا قابو پالیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات میں کسی مخلصی کا بھی انتظام نہیں کرسکا تھا تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلادیا تھا کہ تھانیدار اگر اس کا قریب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب لوگ زمین پر وہ پھٹے پرانے بدبودار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے، نچنت سے ہو کر پڑ رہے۔

"اوہو غضب ہو گیا!" اچانک نکّو نے کہا اور وہ لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں، کیوں، خیر تو ہے؟" اندھیرے میں جواریوں نے پوچھا۔

"بھئی اگر پتا ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے اور مزے سے ساری رات کھیلتے۔ . . . کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیج کر تاش اور موم بتی منگا لوں؟"

"نہ نہ بابا معاف کرو،" کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

"تم جانو۔" نکّو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے "ورنہ اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانیدار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا۔ . . ."

اگلے روز صبح کو کوئی نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آکر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا:

"او جواریو اٹھو۔ تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے۔"

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار نکّو کی طرف اُٹھ گئیں۔ نکّو نظریں ترچھی کرکے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد یہ دسوں آدمی تھانے کے چھوٹے سے میدان میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر تھانے دار کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس دوران میں نکّو برابر اپنے لطیفوں، پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں سے اپنے ساتھیوں کا جی بہلاتا رہا۔ مگر جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور تھانیدار نظر نہ آیا تب تو سب جواری بہت گھبرائے۔ ہنسی ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ سب کے چہرے اُتر گئے اور ایک بدگمانی کی لہر ان میں پھیل چلی۔ وہ بار بار فکرمندی کے ساتھ نکّو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے اور نکّو جواب میں ہر ایک کو ہاتھ سے صبر کا اشارہ کر دیتا۔ اس عرصے میں دو تین سپاہی ان جواریوں کے پاس سے گزرے اور نکّو نے ہر ایک کو "خانصاحب جی" "خاں صاحب جی" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر نہ تو انہوں نے نکّو کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ پلٹ کر ہی اس کی طرف دیکھا۔

آخر جب انہیں کھڑے کھڑے پورے دو گھنٹے گزر گئے اور ان کی ٹانگیں تھک کر چور ہو گئیں تو ایک سیاہ لاری تھانے کے اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے تھانے دار اور کئی سپاہی نکلے۔ تھانے دار کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور سپاہیوں کے کندھوں پر بندوقیں۔ انہیں خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جس مہم پہ وہ صبح ہی صبح گئے تھے اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور یہ مہم ضرور کچھ بڑی ہی اہم مہم ہو گی، جبھی تو تھانے دار پریشان پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

نکّو دور ہی سے تھانے دار کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"وہ آ گیا میرا موتیوں والا" اس نے کہا "بس اب گھبراؤ نہیں۔ دو تین ہی منٹ میں بیڑا پار ہوا چاہتا ہے۔"

یہ کہہ کر نکّو نے دور ہی سے تھانے دار کو ایک فرشی سلام کیا۔ تھانے دار کی یا تو

اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی بارکوں میں چلا گیا۔
"نکو،" وثیقہ نویس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا: "میں جانوں تھانے دار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ وہ تمہارے سلام کا جواب ضرور دیتا۔"

"اجی توبہ کرو،" نکو نے کہا: "تھانے دار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دے گا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے رعب میں، کیا سمجھے! تھانیداری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم سے سیدھے منہ بات کرے تو سپاہیوں پر رعب کیسے جمارہے۔ کل کو یہی سپاہی اس کے ناک چنے نہ چبوادیں اور سپاہی تم جانو مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں، جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی بس لگے اینٹھنے، سر پر سوار ہونے . . . . ."

پانچ منٹ کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس سے گزرتا ہوا تھانے کے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا اور وہاں کھڑے کھڑے بدستور سپاہیوں سے باتیں کرتا رہا۔

اتنے میں تھانے کے دفتر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ذرا سی دیر میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا تھانے دار کے پاس پہنچا۔ جب تھانے دار تنہا واپس آ رہا تھا تو نکو نے ایک بار پھر اسے سلام کیا۔ تھانے دار نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا،" نکو نے فتح مندانہ لہجہ میں کہا: "میرے سلام کا جواب نہیں دے گا۔ کیوں دیا جواب؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن،" نکو نے پھر کہنا شروع کیا: "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے، کوئی

سپاہی آس پاس نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اتنی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے بُرا حال کر دیا۔"

تھانے دار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر بے صبر ہو چلے تھے کہ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر پیشی کی اطلاع دی تھی دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر اپنے اکھڑ لہجے میں کہنے لگا:

"او جواریو! سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کر کے اُٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں۔"

تھانے دار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکا بکا رہ گئے اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگے۔

"اُلوؤں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟" یہ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ پھر دہرا دیئے۔

اس پر وثیقہ نویس اور من سکھ پنواڑی بے اختیار آگے بڑھ کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خانصاحب ہم بالکل بے قصور ہیں۔" انھوں نے یک زبان ہو کر گڑگڑا کر کہا۔ "یہ سب لوگ گواہی دیں گے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم بالکل بے قصور ہیں۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتا" سپاہی نے کہا۔ "داروغہ صاحب کا حکم یہی ہے۔"

"خاں صاحب جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر حضور سے کہہ دیں کہ ہم دونوں بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ یہ سب لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔"

"میں گواہی دواہی کچھ نہیں جانتا" سپاہی نے کہا۔ "داروغہ صاحب نے سب کے لئے یہی حکم دیا ہے۔ ہاں اور سنو۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب کو پھر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ دیکھو دیر نہ کرو۔ مجھے داروغہ صاحب کے ساتھ ابھی ابھی باہر جانا ہے۔ لاری تیار کھڑی ہے۔ تم نے دیر کی تو میں پھر سب کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

وثیقہ نویس اور من سکھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کے کسی جواری کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار نکو پہ پڑتی تھیں۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانیدار کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتی تھیں۔

"دیکھو دیکھو۔" سپاہی نے کہا۔ "تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھے مجبوراً تم سب کو حوالات ہی میں بند کر دینا پڑے گا۔"

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ نکو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سکھ

کی ہمت بندھی اور اس نے بھی ننگو کی پیروی کرہی دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک ادھرادھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ، گدی سے پکڑ زبردستی نیچے بٹھا دیا اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے۔ صرف چمڑے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بار بار کمر بند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا۔ شیخ جی نے دل کڑا کیا، پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے، گردن پھرا کر اپنے ارد گرد نظر ڈالی اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انہوں نے بھی تھانیدار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی جس وقت وہ اٹھا تو ننگو زور سے کھنکھارا۔ "مرزا جی سنبھل کے۔" اس نے کہا۔ "سب اپنے ہی آدمی ہیں ہاں۔ دیکھنے میں زور کا ہاتھ پڑے مگر...... سمجھ گئے نا......"

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "داروغہ صاحب کہتے ہیں۔" اس نے پاس آکر کہا۔ "اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوا لیں۔ چنانچہ کوئی بیس منٹ کے بعد جب ہر ایک نے ہر ایک کے دس دس جوتے

لگائیے تو وہ اس کام سے نمٹ، کپڑے جھاڑ، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا۔ "جاؤ۔ اب کے داروغہ صاحب نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے۔ پھر کبھی جوا نہ کھیلنا۔"

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک تو وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کئے۔ اس کے بعد نکّو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ "کیوں دیکھا!" اس نے کہا۔ "نہ چالان، نہ مقدمہ، نہ قید، نہ جرمانہ! میں نہ کہتا تھا اسے مذاق ہی سمجھو!"

۱۹۴۷ء

ہمسائے

اس پہاڑی پر وہ فقط دو ہی گھر تھے۔ مکان تو اصل میں ایک تھا مگر بعد میں اس کے مالک نے اس کے بیچوں بیچ لکڑی کی ایک پتلی سی دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اَب اس میں الگ الگ دو خاندان رہتے تھے۔ پہاڑوں پر مکان ویسے ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر دو حصوں میں بٹ جانے سے اس کی مکانیت محض نام کو رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس کے رہنے والوں کو اگر یہ تسلی نہ ہوتی کہ وہ گرمی کا زمانہ پہاڑ پر بسر کر رہے ہیں تو وہ بہت ہی آزردہ رہا کرتے۔

لکڑی کا بنا ہوا مخروطی وضع کا یہ مکان جس پر سرخ روغن کیا گیا تھا پہاڑی کی ایک ڈھال پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے لکڑی کا ایک لمبا زینہ چڑھنا پڑتا تھا۔ مکان کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی جس کو ہموار کر کے پھلواری بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر وہ پھلواری بے توجہی کا شکار ہو کے رہ گئی تھی اور اب اس میں ڈیلیا کا ایک آدھ پودا ہی رہ گیا تھا جو گویا بڑی ڈھٹائی سے اس کی یاد کو قائم رکھنے پر مصر تھا۔

اس پھلواری کے سرے پر لکڑی کا ایک بنچ رکھا تھا۔ اس پر بیٹھتے تو نیچے وادی کا حسین مگر اُداس اُداس منظر دکھائی دیتا۔ جتنی دیر سورج غائب رہتا ہلکی ہلکی نیلی دُھند مکڑی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔ جب سورج نکلتا تو دھند ایکا ایکی سنہری ہو کر اس مرقع کو اور بھی حسین بنا دیتی۔ مگر چند ہی لمحوں بعد آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی اور دیکھنے والا جلد ہی اپنی نظریں پھیر لیتا۔

اگست کی ایک صبح کو ابھی آفتاب نے مشرقی سلسلۂ کوہ کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گھر میں سے نکلا۔ اس کی عمر مشکل سے آٹھ نو برس کی ہوگی۔ اس نے سرخ اون کا پل اوور اور نیکر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بادامی رنگ کا فل بوٹ تھا جس کے کنارے مینہ سے بھیگ بھیگ کے سیاہ پڑ گئے تھے۔ لکڑی کے برآمدے سے اترتے ہی لڑکے کی نظر بے اختیار ساتھ والے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ مگر اس کا دروازہ ابھی بند تھا۔ لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح مایوس پلٹیں گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو جسے دکان دار اپنی سستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔ اس کے بعد اس کی نظر سامنے ڈیلیا کے پودے پر پڑی جس میں ایک بڑا سا سرخ پھول صبح کی سنہری دھوپ میں بڑی تمکنت سے جھم جھما رہا تھا۔ اس پھول نے لڑکے کے دل کو لبھا لیا اور وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ کئی لمحوں تک حیرت سے اس کی طرف تکتا رہا۔ اوس کی ننھی ننھی بوندیں اس کی پنکھڑیوں پر لرز رہی تھیں اور ان میں پھول کا عنابی رنگ جھلکتا ہوا بہت بھلا لگتا تھا۔ لڑکے نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر پر نظر ڈالی اور پھر بڑی احتیاط سے پھول کو توڑ لیا۔

وہ خوشی خوشی پھول کو ہاتھ میں تھامے ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا اور کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس دروازے کے اوپر کے حصے میں شیشے جڑے ہوئے تھے جن میں سے اندر کا اودے رنگ کا ملگجا سا پردہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا جیسے سوچ رہا ہو، دروازہ کھٹکھٹائے یا نہیں کہ اتنے میں لکڑی کے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی۔ لڑکا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کا وہ ہاتھ جس میں ڈیلیا کا پھول تھا آپ سے آپ پیٹھ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک بھاری بھرکم آدمی شب خوابی کا لباس پہنے، کمبل کی بُکل مارے ایک ہاتھ سے مسواک کرتا، دوسرے میں بھیلا تھامے، باہر نکلا۔ پہلے تو اس نے لڑکے کی طرف توجہ نہ کی مگر برآمدے سے نیچے قدم رکھتے ہی وہ مڑا۔

"کیا بات ہے اکبر میاں؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں۔" لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اچانک مدھم پڑ گئی تھی۔

"بیری سے کھیلنے آئے ہو؟"

"جی . . . . ." اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیری تو سو رہی ہے ابھی۔"

لڑکے نے نظریں جھکالیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اکبر میاں؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی پھول ہے۔" اور اس نے ڈرتے ڈرتے پھول سامنے کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ہاتھ شبنم سے ابھی تک گیلا ہو رہا تھا۔

"بیری کے لیے؟"

"جی . . . . ."

"بیری تو سو رہی ہے اور پھر ابھی سویرا بھی تو ہے۔"

لڑکے نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

"آج اتوار ہے نا؟ تم اور بیری دن بھر خوب کھیلنا۔"

یہ اس شخص نے چلتے چلتے کہا۔ پھر وہ مسواک کرتا ہوا احاطے کے زینے سے اتر گیا اور اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی۔

جب تک پگڈنڈی کے پیچ وخم اس شخص کو کبھی چھپاتے کبھی دکھاتے رہے اکبر برابر برآمدے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اکبر نے ایک اور مایوسانہ نظر ساتھ والے کمرے پر ڈالی اور پھر برآمدے سے اتر کر وہ ڈیلیا کے پودے کے پاس چلا آیا جس میں اب کوئی دل کشی نہیں رہی تھی۔ وہ شاخ جس سے اس نے پھول توڑا تھا ٹنچی ٹنچی سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "اب مجھ میں اور کوئی پھول نہیں آئے گا۔"

اکبر پودے کے پاس سے ہٹ آیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج اب لمبے لمبے پیازی بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا اور اس نے نڈر ہو کر اپنا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھند جو نچلی وادی پر چھائی ہوئی تھی دھیرے دھیرے دھوپ میں تحلیل ہو رہی تھی اور نیچے کا منظر لمحہ بہ لمحہ نکھرتا آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں میں انسانی چہرے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی اضطراری حرکتیں ان سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ نے جس پر ابھی نیند کا اثر تھا جسم کی حرکات پر قابو رکھنا شروع نہیں کیا۔

نیچے دور سے اکبر کے سکول کی گرجا نما عمارت نظر آ رہی تھی جس پر بادنما مور بنا ہوا تھا۔ ایک مکان کی انگنائی میں، جو نشیب میں واقع تھا، ایک گرہستن چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہی تھی۔ قریب ہی دیوار کی ایک شاخ پر ایک خوش رنگ چڑیا اپنی لمبی چونچ سے اپنی دُم کے بال سونت رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اداسی سے چہک بھی اٹھتی تھی۔

اکبر اس نظارے میں ایسا محو ہوا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس نے ڈیلیا کے پھول کی ایک پتی نوچ لی۔ جب اسے اپنی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے ایک ایک

کر کے ساری پتیاں نوچ ڈالیں اور ڈنٹھل کو ہوا میں اچھال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈنٹھل کو نیچے دور تک کھڈ میں گرتے دیکھتا رہے گا۔ مگر وہ تھوڑی ہی دور پر ایک جھاڑی میں اٹک کر رہ گیا۔

ایکا ایکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سورج کی ساری دوڑ دھوپ کو بادلوں کے ایک جھرمٹ نے چھپا لیا اور پھر ایک ہی دم بوندیاں آنے لگیں۔

گرہستن نے منہ اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جلد جلد سارے کپڑے الگنی پر سے اتار لئے۔ جس گھر سے اکبر نکلا تھا اسی میں سے ایک اور لڑکا دوڑتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کا لباس بھی قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا اکبر کا تھا۔ مگر اس کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔

"بھائی جان۔" اس نے چلّا کر کہا۔ "امّی بلا رہی ہیں۔"

اکبر نے کچھ جواب نہ دیا۔

"بھائی جان۔ امّی کہتی ہیں ناشتہ کر لو۔"

اکبر نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بدستور گھر کی طرف پیٹھ کئے بنچ پر بیٹھا رہا۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ مگر پل بھر کے بعد وہ پھر آیا۔

"بھائی جان امّی خفا ہو رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"سُن لیا سُن لیا۔" بالآخر اکبر نے گردن پھیری۔ "آتا ہوں، آتا ہوں۔"

چھوٹا لڑکا پھر اندر چلا گیا۔ ایک لمحہ بھی نہ گذرا تھا کہ ایک عورت جس کی جوانی ڈھل چکی تھی بڑے بڑے پھولوں والی بنفشئی رنگ کی ساری کو کولھے پر سے سنبھالتی ہوئی برآمدے میں نمودار ہوئی۔

"اکبر بیٹے۔" اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔ "اندر کیوں نہیں آتے میرے لعل،

ناشتہ کیوں نہیں کرتے، بوندیاں آ رہی ہیں اور تم مینہ میں بیٹھے بھیگ رہے ہو۔ واہ بھئی واہ۔ اور کہیں زکام ہو گیا تو۔ ابھی تو بیماری سے اٹھے ہو۔ جلدی سے آ جاؤ میرے پیارے۔"

"میں آ ہی رہا تھا امی جان۔" اکبر نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مینہ سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتا، سہج سہج قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر کے دروازے پر نظر ڈالی۔

مینہ کوئی پاؤ گھنٹہ تک برسا کیا۔ اس کے بعد ایک دم مطلع صاف ہو گیا اور سورج نے پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو کر اپنا سفر شروع کر دیا۔

دونوں لڑکے پھر اسی گھر سے نکلے۔ اکبر ڈیلیا کے پودے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور چھوٹا لڑکا ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بے دھڑک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"ہیری!" اس نے چلا کر کہا۔

"ہیری!!" اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اور بھی زور سے چلا کر کہا۔ "تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں۔ سچ مچ کا ہوائی جہاز ہے ان کے پاس۔ آؤ دیکھو۔"

"کیا ہے منیر میاں؟" اندر سے ایک ننھی سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔" منیر نے کہا۔

"چٹخنی لگ رہی ہے، میرا ہاتھ نہیں جاتا، امی غسل خانے میں ہیں۔"

"رات ماموں ہمارے لیئے بڑا اچھا ہوائی جہاز لائے۔" منیر نے کہا۔

"کہاں ہے وہ ہوائی جہاز؟"

"بھائی جان کے پاس۔"

"اچھا میں آتی ہوں۔"

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی سات برس کی ہوگی برآمدے میں آئی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا پھولدار ریشمی کُرتا اور کلی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر فیروزی اون کا کوٹ نما سویٹر تھا۔ دونوں شانوں پر ایک ایک چٹیا تھی جس کے سرے پر سفید ربن بندھا ہوا تھا۔ سینے پر آسمانی رنگ کے ہوائی ریشم کا ننھا سا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سبز سوئڈ کے سینڈل تھے۔

ان دونوں بھائیوں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ ایک جھونکے کی طرح ان کے پاس پہنچی۔ جیسے ہی منیر کی نظر اس کے چہرے پر پڑی وہ ٹھٹھا مار کے ہنسنے لگا۔

"اوہو ہو ہو بیبری!" اس نے کہا۔ "کتنا پوڈر مل رکھا ہے تم نے۔ تمہاری پلکیں کیسی سفید ہو رہی ہیں پوڈر سے۔"

"کب؟" لڑکی کی ساری چونچالی کافور ہو گئی۔

"چپ رہو منیر۔" اکبر نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ بتائی۔

"ذرا شیشے میں جا کر منہ تو دیکھو۔" منیر نے کہا۔

بیبری نے انگلی سے اپنے گال کو چھوا۔ تھوڑا سا پوڈر اس کی انگلی کے سرے پر لگ گیا۔

"دیکھا . . . . ."

"بس جی بس۔" بیبری نے اچانک بگڑ کر منیر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "ہم نہیں بولتے تم سے۔"

"منیر تم چپکے نہیں رہے تو میں پیٹ دوں گا تمہیں۔" اکبر نے منیر پر آنکھیں نکالیں۔

"اکبر میاں۔" بیبری منیر کو بالکل نظر انداز کر کے، گویا وہ وہاں موجود ہی نہ تھا، اکبر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کہاں ہے وہ ہوائی جہاز جو تمہارے ماموں رات لائے ہیں؟"

"ابھی دکھاتا ہوں۔"

"ہے کہاں وہ ؟"

"گھر میں رکھا ہے۔"

"تو لاؤ ابھی۔"

"ابھی لاتا ہوں۔"

"نہیں ابھی لاؤ۔"

"گھر میں رکھا ہے چل کے دیکھ لو نا اندر۔"

"نا بھئی ہم نہیں جانے کے تمہارے گھر۔" ببری نے آنکھیں پھرا کر کہا۔ "اس دن تمہاری امّی خفا ہوئی تھیں ہم پر۔"

"واہ۔ تم پر تھوڑا ہی خفا ہوئی تھیں۔ وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھیں۔"

"تو تم یہیں لے آؤ نا ہوائی جہاز!"

"اچھی بات۔ تم یہیں ٹھہرو، جانا نہیں۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" اور وہ گھر کی طرف دوڑا۔ منیر ٹکٹکی باندھے ببری کے چہرے کو تک رہا تھا، مگر ببری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ نیچے وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عین اس وقت وہ شخص جو صبح کمبل اور تھیلا لے کے گیا تھا کاٹھ کے زینے پر چڑھتا دکھائی دیا اور ببری مارے خوشی کے "ابّا جان" "ابّا جان" چلاّتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

جس وقت اکبر ہوائی جہاز لے کر گھر سے باہر آیا تو ببری ابّا کے تھیلے کو جو پھل اور سبزی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا تھا ایک طرف سے پکڑے ان کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ اکبر اور منیر بنچ کے پاس کھڑے ببری کی راہ دیکھا کئے۔ مگر وہ

باہر نہ آئی۔

اکبر نے منیر کو ہوائی جہاز دے کر کہا "یہ ہوائی جہاز لے جاکر بیری کو دکھا دو۔"

"آپ نہیں چلتے ؟"

"نہیں میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ کہنا بھائی جان تمہیں بلا رہے ہیں، شاباش۔"

لکڑی کا یہ ہوائی جہاز جس پر ہلکا ہلکا آسمانی رنگ کیا گیا تھا، خاصا بڑا تھا۔ منیر اسے بڑی مشکل سے سنبھالتا ہوا بیری کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اسے اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

"بیری" اس نے باہر ہی سے چلّا کر کہا "لو دیکھ لو یہ رہا ہوائی جہاز!"

بیری آم چوستی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔

"چیخ کیوں رہے ہو تم ...... اچھا تو یہ ہے ہوائی جہاز جو کل تمہارے ماموں لائے ہیں؟ اوہّو کتنا بڑا ہے!"

"بھائی جان سامنے کھڑے ہیں۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

بیری اور اکبر کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اکبر اسے دیکھ کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔

"منیر میاں" بیری نے کہا "اپنے بھائی جان سے کہو میں ٹھہر کے آؤں گی۔ ہم آم چوس رہے ہیں اس وقت۔"

منیر ہوائی جہاز لے کر اکبر کے پاس پہنچا۔ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے اور وادی کی سیر دیکھنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے مگر بیری نہ آئی۔

آسمان پر رفتہ رفتہ بادل پھر چھا گئے تھے۔ اب کے بادل بہت گھنے اور قریب تھے چنانچہ ہر طرف بھاپ ہی بھاپ پھیل گئی جس نے ہر چیز کو اوجھل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی

ایک دم زور کا جھالا پڑنے لگا۔ اکبر اور منیر کو ہوائی جہاز اٹھا کر گھر میں گھستے ہی بنی۔

یہ بارش کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ تک رہی اور اس کے بعد پھر دھوپ نکل آئی۔

"ببری"۔ اکبر ایک ہاتھ میں بڑی سی گیند لئے جس پر انگریز بچوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں اور دوسرے میں ایک بڑی سی کتاب تھامے ببری کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"ببری"۔ اس نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔

"کیا ہے اکبر میاں؟" ببری نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو آئیں ہی نہیں!"۔

"کب؟"

"اس وقت۔"

"واہ۔ مینہ جو پڑ رہا تھا موسلا دھار۔ کہاں ہے ہوائی جہاز؟"

"وہ تو میں نے رکھ دیا۔ لو یہ دیکھو تصویروں کی کتاب!"

"اسی لڑکی کی کہانی ہو گی جو چٹیا نہیں کراتی تھی؟"

"ہاں۔"

"واہ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"اچھا تو آؤ گیند سے کھیلیں۔"

"ہم گیند سے نہیں کھیلتے بھئی۔ امّی کہتی ہیں، پھسلن ہو رہی ہے، باہر نہ جانا، پاؤں رپٹ گیا تو کھڈ میں گر کر ہڈی پسلی چور چور ہو جائے گی۔"

"اچھا تو ہم تمہارے برآمدے ہی میں کھیلیں گے۔"

نہیں گیا ہوگا۔ ہائے ہوتا کوئی ہمت والا، ابھی جاکر اسے پکڑ لاتا۔"

"گھبراؤ نہیں، میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں۔" اچانک مولانا کی مردانگی نے جوش مارا۔ مگر باہر اس وقت ایسی ہمت شکن سردی پڑ رہی تھی کہ فوراً ان کو اپنے اس ارادے میں ترمیم کرنی پڑی۔

"پکڑ تو میں اسے ضرور لاؤں گا" وہ بولے۔ "پاتال میں ہوگا، پاتال سے بھی کان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آؤں گا۔ مگر ذرا دن نکل آئے۔ اس وقت اندھیرے میں کہیں چھپ گیا تو نظر تھوڑا ہی آئے گا سوئر کا بچہ۔"

"بس رہنے دو مولانا صاحب۔" فرخندہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "اس وقت آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ صبح کو میں خود ہی کسی کو تھانے بھیج کر رپٹ لکھوا دوں گی۔"

مولانا کو اپنے معقول عذر کے جواب میں یہ سرد مہرانہ کلام سننے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انہوں نے تکیے کے نیچے سے اپنی پگڑی نکال، دو ایک دفعہ اسے جھٹکا اور پھر سر پر باندھ لیا۔ پھر کمبل جھاڑ اس کی بکل ماری اور جوتی پہن کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ ٹھٹھرتے ہوئے واپس آئے۔ اس اثنا میں فرخندہ غم سے نڈھال، اپنی کوٹھڑی میں جاکر لیٹ رہی تھی۔

"میں سارے میں دیکھ آیا مردود کو۔" وہ فرخندہ کے پلنگ کے پاس آکر کہنے لگے۔ "پہلے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سارے مسافر خانے دیکھ ڈالے۔ ایک ایک قلی سے پوچھا۔ جب کہیں نظر نہ آیا تو وہاں سے سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ ایک لاری میں دو مسافر سو رہے تھے۔ باقی سب خالی پڑی تھیں۔ پھر ادھر سے باغ میں دیکھتا بھالتا پتھر والی سرائے میں آیا مگر وہاں بھی اس مردود کا کھوج نہ ملا۔ . . . . بی بی تم فکر نہ کرو۔

دُور افق کے پاس وہ پہاڑیاں جو عموماً بادلوں کے غبار میں کھوئی کھوئی رہتی تھیں اچانک مطلع صاف ہو جانے سے اب واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔ بعض پہاڑیاں ہری بھری تھیں اور بعض ٹُنڈ منڈ۔ مگر وہ آپس میں ایسی غلط ملط ہو رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لحاف کی کہیں تو اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہے اور کہیں اندر کا خاکستری استر۔

اکبر اس نظارے کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ اس کے تین ہم جماعت اس کی بنچ کو گھیرے ہنس رہے ہیں۔

"اوہو! تم لوگ ہو۔" وہ چونک اٹھا۔ "تم کب آئے؟"

"اکبر۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو، چلو ہمارے ساتھ فٹ بال کھیلنے!"

"تم جاؤ، مجھے کام ہے بھئی۔" اکبر نے کہا۔

"واہ۔ یہ خوب کہی۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔ "نہیں تمہیں چلنا ہوگا۔ دیکھو ہم نے آج ہی تو یہ نیا فٹ بال خریدا ہے۔"

"نہیں میں آج نہیں جاؤں گا۔"

"آخر کیوں؟"

"مجھے کام جو کرنا ہے بھئی۔"

"کیسا کام؟"

"کیسا کام..... واہ اسکول کا کام جو دیا تھا ماسٹر صاحب نے!"

"تم تو سچ مچ نہیں چلوگے ؟"

"نہیں آج نہیں کل۔" اور وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔

"رہنے دو بھئی۔" ایک لڑکے نے کہا۔ "نہیں چلتا تو نہ چلے۔" اور وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

شام کے چھ بج چکے تھے جب بیری اپنے ابا اور امی کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔

ابا جیب سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھولنے لگے، امی برقعہ اتار کر برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں بیری گھر میں بقچہ چھوڑ کر باہر بنچ کے پاس آگئی جہاں اکبر بیٹھا ہوا تھا۔

"بیری تم آگئیں!" اور وہ جلدی سے بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کپڑا خرید لیا؟"

"ہاں۔ میرا بڑا خوبصورت ریشمی سوٹ بنے گا۔ اس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول ہیں اور پھر ابا نے ہمیں بنارسی اوڑھنی بھی لے دی اور نئی سینڈل بھی۔ پھر ہم نے سینٹ بھی خریدا۔ لپ اسٹک بھی اور نیل پالش بھی۔" اس کی آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

"بیری تم . . . . . ."

"مجھے بیری نہ کہا کرو جی۔" ایک لمحہ ہی میں وہ بگڑ گئی۔

"پھر کیا کہا کروں؟"

"میرا نام ہے امیر النسا بیگم۔" یہ کہتے کہتے اس کے لہجہ میں بڑوں جیسی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

"مگر تمہاری امی تو تمہیں بیری ہی کہتی ہیں۔"

"اونہہ۔"

"اور تمہارے آپا بھی۔"

"انہیں کہنے دو۔"

"ہم بھی تمہیں بیری ہی کہیں گے ...... بیری!"

"دیکھو جی میں پھر کسے دیتی ہوں، مجھے بیری نہ کہا کرو۔"

"اگر کہوں تو ......؟"

"ہم تم سے نہیں بولیں گے ..... جاؤ میں تم سے نہیں بولتی، میں گھر جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اکبر کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پل بھر کو رُکی۔ پھر گھر کا رُخ کر، پھلواری میں دوڑتی ہوئی، تتلی کی سی ادا کے ساتھ آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اکبر نے اسے واپس بلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چند لمحے دم بخود کھڑا رہا۔ پھر سہج سے آ کر اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔

ذرا سی دیر میں سورج ڈوب گیا اور آس پاس کی پہاڑیاں قرمزی بادلوں میں کھو گئیں۔ نیچے وادی میں جابجا سفید سفید دھوئیں پھوٹ رہے تھے، درختوں کی چوٹیوں سے، مکانوں کی چھتوں سے، پہاڑوں کی ڈھالوں سے، جس سے وادی کا منظر دھندلا دھندلا ہو گیا تھا۔ اکبر کی نظر اپنے اسکول کی عمارت پر پڑی جس کے باو جود کو اس وقت ابخرات کے غبار نے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس کے ہم جماعت ابھی تک اسکول کی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے ہوں گے۔ اس کو اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں گیا تھا اور نہ اس کی پروا کہ شاید وہ اس سے ناراض ہو گئے ہوں۔ رہا اسکول کا کام تو اس کی بھی اس کو زیادہ فکر نہ تھی۔ شاید کوئی بہانہ کارگر ہو جائے اور وہ لگلے

روز ماسٹر کی جھڑکیوں اور تھپڑ سے بچ جائے۔

ہوا میں اب خاصی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ کر بغلوں میں دبا لیں اور شانوں کو سکوڑ لیا۔ شاید اسے بیری کو بیری نہیں کہنا چاہیے تھا۔ . . . وہ سوچ رہا تھا، خواہ مخواہ کی لڑائی اس نے مول لی۔ وہ اب خاصی بڑی ہو گئی ہے۔ ہلکے سبز رنگ کے پھولدار ریشمی کرتے اور کلی دار پاجامے میں وہ کتنی سمجھ دار معلوم ہوتی تھی۔ اکبر کی آنکھیں بھر بھر آرہی تھیں۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔

اب شام ہو چکی تھی، نیچے وادی پر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے درختوں کے تنوں سے لپٹنا، مکانوں کا احاطہ کرنا اور پہاڑیوں پر لمبے لمبے سایے ڈالنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں اکبر کا اسکول، گھنٹہ گھر اور دوسری عمارتیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے آسمان تک ایک سیاہ چادر تن گئی جو انسان، حیوان، شجر، حجر ہر شے کو اپنے میں لپیٹنے لگی اور بالآخر اس نے اکبر کو بھی چھپا لیا، اس کے جسم ہی کو نہیں، اس کی رُوح کو بھی۔

سنہ ۱۹۴۷ء

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدُود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سایے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بخارات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں

پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں، ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگدار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے۔ سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے، اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک

سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں
خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر
غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان
پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر الساتی ہے بلکہ یہ کہ انہیں دفتر میں دن بھر
اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت
کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں
بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنہیں ابھی اسکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ
جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا
اور جنہیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر
کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آگیا تھا اور کند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈتے
رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے
بیشمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے
جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں
کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔
تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے
اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی

سیڑھیوں کے گرد واگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دُو دُو منٹ رُکتا، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلا شبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بیکار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی ہیٹریاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پُرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھُس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھینگ، بُدھ کا نیم قد مجسمہ . . . . .

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیے ؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا !"

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا، دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرتے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیئے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے ؟ سوا روپیہ بھی نہیں۔ . . . اچھا صاحب لیجئے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو ہٹ کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے . . . . . یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ گویا تو وہ اس مرمریں

ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیٔ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا۔ مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے

کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے تو بڑا سا مکان چاہیئے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے . . . . .

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصۂ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی۔ مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبہ کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملنا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہوگئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لئے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کرکے اسے تین مہینے کے لئے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی

جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبہ کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا، پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اُس کے لئے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لئے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لئے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے . . . . . ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے . . . . . ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے . . . . .

مگر جب تین مہینے گزر گئے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آجانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لئے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔

مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

اَب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لئے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیئے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اَب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدّی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے۔ مگر اب ان کی کیفیت

پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اَب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے نوکریوں کی تلاش —— یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی۔ مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء

حمام میں

(۱)

نام تو تھا اس کا فرخندہ بیگم مگر سب لوگ اسے فرخ بھابی' فرخ بھابی کہا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کی رسم سی پڑگئی تھی ورنہ رشتہ ناطہ تو کیا کسی نے اس کے مرحوم شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ کسی کی بھابی تھی یا نہ تھی مگر اس کی خدمت گزاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ نام اس پر پھبتا خوب تھا اور وہ خود بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مردوں کی خدمت کا خاص جذبہ لے کر دنیا میں آتی ہیں، بچپن میں بھائیوں پر جان چھڑکتی ہیں، کنوار پنے میں باپ کو سکھ پہنچاتی ہیں، شادی کے بعد شوہر کی تابعداری کرتی ہیں اور بڑھاپے میں بیٹوں کے ناز اٹھاتی ہیں۔

وہ چھوٹے سے قد کی ایک چھوٹی سی عورت تھی مگر اس کا چہرہ اس کے قد کے تناسب سے کافی بڑا تھا۔ اگر کبھی وہ آپ کے سامنے فرش پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے بیٹھی ہو اور آپ نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور اسے کسی ضرورت سے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑے تو آپ کی آنکھیں یہ انتظار ہی کرتی رہ جائیں گی کہ ابھی وہ اور اونچی ہو گی۔

اس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تھی جس نے اس کے چہرے کے سادہ خدوخال کو حد درجہ جاذب بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بڑے بڑے دقیق مسائل کی گفتگو میں بھی اس کی کم علمی کو چھپائے رکھتی تھی۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور پیشانی پر بال کچھ ایسے گچھے دار تھے کہ

اسے مانگ نکالنے میں بہت دقّت پیش آتی۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے بالوں کو مردوں کی طرح پیچھے الٹ دیا کرتی۔ سفید کرتا، سفید شلوار اور اس کے ساتھ سفید ہی دوپٹہ، یہ سادہ ہندوستانی لباس اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس لباس کے ساتھ جس وقت وہ شام کے جھٹپٹے میں مصلے پر اپنے سامنے موتیا کی اَدھ کھلی کلیاں رکھ کر نماز میں مشغول ہوتی تو دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔

کبھی کبھی اپنے دوستوں کے اصرار پر وہ ساری بھی پہنا کرتی مگر اس میں بھی بھڑکیلے رنگوں سے گریز کرتی۔ ساری کے ساتھ وہ ایک خاص بلاؤز پہنتی جس کا گلا بند ہوتا اور آستینیں پوری۔ یہ اس کی اپنی ایجاد تھی۔ ایسے موقع پر بربط کی شکل کا ایک ننھا سا طلائی زیور جس میں نگینے جڑے ہوئے تھے ایک سیاہ ربن کے ساتھ اس کے گلے میں بندھا ہوا نظر آیا تھا۔

شہر کی فصیل کے پاس ایک بدبودار احاطے میں اس کا مکان تھا۔ مکان کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے لیے ایک لمبی اور تنگ ڈیوڑھی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بارہ تیرہ ٹوٹی پھوٹی بے ڈھنگی سیڑھیوں کا زینہ چڑھنے پر ایک وسیع دالان آتا تھا، آدھا کھلا ہوا آدھے پر چھت، کھلے ہوئے حصے کے ایک کونے میں بیت الخلا تھا اور چھت والے حصے میں دیوار سے ملا ہوا مٹی کا چولہا۔ چولہے کے اغل بغل دو کوٹھڑیاں تھیں۔ یہ تھی اس مکان کی مختصر کیفیت جس میں فرخ بھابی رہتی تھی۔

یہ ان مکانوں میں سے تھا جن میں سفیدی وغیرہ یا تو اس وقت ہوتی ہے جب وہ بنائے جاتے ہیں یا پھر اس وقت جب ان کی خرید و فروخت کی بات چل رہی ہوتی ہے۔ اس مکان کی دیواروں کو دیکھ کر، جن پر سے چونے کا پلستر اکھڑ کر اینٹیں نظر آنے لگی تھیں، گمان ہوتا تھا کہ کم سے کم پچھلے بیس برس میں اس کے مالکوں کے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ دیواروں میں جگہ جگہ کوب نکل آیا تھا۔ دھوئیں نے دروازوں اور چھت کی کڑیوں پر سیاہی

پھیر کر ان کے کئی عیبوں کو چھپا لیا تھا۔ دونوں کوٹھڑیوں میں ایک ایک طاق تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ شروع شروع میں یہ طاق بہت چھوٹے چھوٹے ہوں گے جیسے پرانی وضع کے غریب ہندوستانی گھروں میں دیا رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ مگر کرایہ داروں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اینٹیں نکال نکال کے انہیں کافی فراخ کر لیا تھا اور اب وہ اس نقب کی طرح معلوم ہوتے تھے جسے چور کھڑ کا سن کر ادھ بیچ ہی میں چھوڑ گئے ہوں —— مگر ان سب باتوں کے باوجود اس مکان کی شان میں کیا کیا قصیدے نہ کہے گئے۔ کن کن خوبصورت ناموں سے اسے موسوم نہ کیا گیا اور وہ کون سے زاویے رہ گئے جن سے اس کے در و دیوار کی تصویر کشی نہ کی گئی!

مکان کی ظاہری خستہ حالی سے قطع نظر جہاں تک اس کی اندرونی صفائی اور رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا کوئی شخص فرخندہ کی نفاست پسندی اور سگھڑاپے پر حرف نہ رکھ سکتا تھا۔ وہ صبح شام دالان اور کوٹھڑیوں میں جھاڑو دیتی اور ہنڈیا چولہے اور دوسرے کاموں سے جو وقت بچتا اسے مکان کی لیپ پوت ہی میں گزارا کرتی تھی۔ دونوں کوٹھڑیوں میں سے جس کی حالت نسبتاً بہتر تھی اس نے اس میں چاندنی کا فرش کر کے اور گاؤ تکیے لگا کے اسے بیٹھنے کا کمرہ بنا لیا تھا۔ دیواروں پر گز گز بھر اونچی سیتل پاٹی لگوا دی تھی تاکہ ٹیک لگانے میں دیوار کی مٹی کپڑوں میں نہ لگنے پائے۔ دوسری کوٹھڑی اس کی خواب گاہ، غسل خانے اور سنگھار کے کمرے کا کام دیتی تھی۔ اسی کوٹھڑی میں وہ تخت بھی تھا جس پر وہ فرائض پنجگانہ ادا کیا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے کپڑوں کا صندوق، روزمرہ کے استعمال کے برتن اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان بھی اسی میں رہتا تھا۔

کسی کسی روز اس کے دوست بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق دسترخوان کی آرائش میں اس کا ہاتھ بٹاتے۔ مثلاً کوئی صاحب شام کو کام سے لوٹتے ہوئے ڈبل روٹی خریدتے لاتے۔

ڈبل روٹی اپنی اور دال بھاجی فرخ بھائی کے ہاں کی۔ کوئی صاحب نصف درجن کیلے یا پاؤ بھر مونگ پھلی لفافے میں لیتے آتے۔ کوئی صاحب تیسرے پہر چھوکرے کے ہاتھ سالم کلیجی بھجوا کر کہلوا دیتے:

"میاں نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ رات کو کھانا وہ اور ان کے ایک دوست یہیں کھائیں گے۔"

کبھی دسترخوان پر کھانے والے زیادہ ہوتے اور کھانا کم تو کوئی صاحب جیب سے جھٹ چونی نکال چھوکرے کو دیتے کہ جا جھٹ پٹ بازار سے چار گرم گرم روٹیاں اور چار کباب لے آ۔ وہ ان باتوں کا کبھی بُرا نہ مانتی بلکہ ایسی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی گویا ان دونوں میں پوری پوری مفاہمت ہے۔

اس کو کمتری کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ جو موجود ہے وہ حاضر ہے، جو موجود نہیں اس کی توفیق نہیں۔ نہ اس نے اپنی حیثیت کو کبھی چھپانے کی کوشش کی نہ کسی خشک دعوت پر اگلی پچھلی کسی تر دعوت کے ذکر سے کمی پوری کرنی چاہی۔ اگر کسی نے اس کی کچھ مدد کی تو مسکرا کر قبول کر لی مگر خود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

کھانے پینے ہی پر موقوف نہیں وہ اور طرح سے بھی اپنے دوستوں کی خدمت کرنے سے دریغ نہیں کرتی تھی مثلاً صبح کو دس بجنے سے کچھ ہی منٹ پہلے کوئی صاحب آ دھمکتے:

"بھابی میری پتلون کا بٹن اکھڑ گیا ہے، کم بخت ابھی ابھی راستے ہی میں اکھڑا ہے۔ میں ویسے ہی دفتر چلا جاتا مگر راستے میں تمہارا گھر پڑتا تھا۔ خیال آیا تمہیں سے ٹنکواتا چلوں اور کہیں سے اکھڑا ہوتا تو گزارہ ہو جاتا، کم بخت سامنے ہی سے اکھڑا ہے۔"

اور وہ ایک شفیق بہن کی طرح پیار اور ملامت کی ملی جلی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی جو گویا کہہ رہی ہوتیں، تم سب شریر ہو، تم اپنے کپڑے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔

اور وہ بلدی جلدی ٹٹن ٹانک دیتی۔

یا مثلاً کوئی صاحب اچانک رات کے دو بجے آ کر اس کے مکان کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیتے:

"فرخ بھابی۔ فرخ بھابی! میری بیوی کنڈی نہیں کھولتی۔ کہتی ہے وہیں جاؤ جہاں رات رات بھر غائب رہتے ہو، خدا کے لیے تم چل کے اسے سمجھاؤ۔"

اور وہ اسی وقت آنکھیں ملتی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی ان صاحب کے ہمراہ ہو لیتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کی مہموں سے عموماً اسے ناکام اور خفیف ہو کے لوٹ آنا پڑتا۔

اس کے ہاں یوں تو کبھی کبھی دن کو بھی ہنگامہ برپا ہا کرتا مگر اصل محفل رات کو آٹھ بجے کے بعد ہی سجا کرتی تھی۔ سب سے پہلے عموماً محسن عدیل آیا کرتا۔ وہ درمیانے قد کا دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ تیس کے قریب عمر، زرد چہرہ۔ آنکھیں بڑی بڑی اداس اور ایسی لبریز کہ معلوم ہوتا بوند ٹپکا ہی چاہتی ہے۔ اگر وہ اپنے کو ذرا سنبھالے ہوئے رکھتا تو خاصا معقول آدمی معلوم ہوتا۔ مگر اس کے بال اکثر وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے ہوتے۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں نکوٹین سے مستقل طور پر پیلی پڑ گئی تھیں جیسے ٹنکچر آیوڈین پینٹ کیا گیا ہو۔ ناخنوں میں نیلا نیلا سا میل بھرا ہوا۔ اگر کبھی چلتے چلتے انگلیوں پر نظر پڑ جاتی تو دیا سلائی یا سگریٹ کی ڈبیا کے کنارے سے اوپر اوپر سے میل کرید لیتا۔ سردی گرمی ہر موسم میں ایک سیاہ بوسیدہ سی شیروانی پہنے رہتا اور ایک سرخ سوتی مفلر جس میں جا بجا سوراخ ہو گئے تھے ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتا۔ جب اس کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو جاتی تو کسی شام وہ اس سے کہتی:

"عدیل میاں! ایک بہت ضروری کام میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ کل دوپہر کو میرے ہاں تشریف لائیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ دیکھیے بھول جائیے گا نہیں۔ بڑا ہی ضروری کام ہے۔"

اور جب عدیل اگلے روز دوپہر کو اس کے ہاں پہنچتا تو وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اس سے کہتی:

"عدیل میاں کچھ اپنے کپڑوں کی بھی فکر ہے؟ دیکھئے آپ کی شیروانی میں کھونچ لگ رہی ہے، لائیے میں سی دوں ورنہ شیروانی زیادہ پھٹ جائے گی۔"

عدیل کے سوکھے ہوئے زرد گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی اور وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا:

"نہیں نہیں رہنے دو تکلیف نہ کرو، پھر کبھی سہی۔"

مگر وہ اس کی ایک نہ سنتی اور شیروانی اتروا ہی لیتی۔ پھر بجائے سینے کے وہ اسے لے جا کر پانی کے ٹب میں ڈال دیتی۔ عدیل اس کا منہ تکتا کا تکتا رہ جاتا۔ اِدھر وہ جھٹ شیروانی کو ٹب سے نکال تسلے میں ڈال اس پر صابن رگڑنا شروع کر دیتی۔

تھوڑی دیر میں چھوکرا حجام کو لیے ہوئے آ جاتا۔

"میاں! حجام آگیا ہے۔ خط بنوا لیجئے۔"

اور اب عدیل سمجھ جاتا۔ اس کے ہونٹوں پر مہر لگ جاتی اور وہ ان باتوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتے ہوئے بھی چپ چاپ اس کا ہر حکم مانے جاتا جیسے کوئی بھیڑ بال کٹائی کے وقت دو چار دفعہ بھیں بھیں کرنے کے بعد اپنی قسمت کو اپنے مالکوں کے ہاتھ سونپ چپ سادھ لیتی ہے۔ وہ کپڑے اتار کر میلی سی چادر باندھ لیتا اور حجامت بنوانے بیٹھ جاتا۔ اِدھر شیروانی کے بعد فرخندہ اس کا کرتا پاجامہ اور مفلر دھوتی۔ ساتھ ساتھ حجام کو تاکید بھی کرتی جاتی:

"خلیفہ جی! بال کافی چھوٹے ہوں گے۔ دیکھنا ہاتھوں اور پیروں کے ناخن لینا نہ بھول جانا۔"

حجامت کے بعد عدیل کو گرم پانی سے نہلایا جاتا۔ وہ خود اس کی پیٹھ اور سر میں صابن ملتی۔ اس کے بعد وہ اپنے صندوق میں سے پلنگ کی ایک اُجلی چادر نکال کر اسے دیتی :

"لیجیے عدیل میاں! اسے لپیٹ کر دھوپ میں چارپائی پہ بیٹھ جائیے۔ ذرا سی دیر میں کپڑے سوکھا چاہتے ہیں۔ میں اتنے میں استری گرم کرتی ہوں۔"

عدیل دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا پہلے سے بھی زیادہ اداس نظروں سے اُسے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے دیکھتا رہتا اور اس کی لبریز آنکھوں سے بوند ٹپکنے کے بالکل قریب ہو جاتی۔

غرض اس طرح دو تین گھنٹے میں اسے آدم صورت بنا دیا جاتا۔

محسن عدیل ایک ناول نویس تھا۔ مگر بدقسمتی سے ابھی اس کا جوہر اہلِ وطن پر نہیں کھلا تھا۔ اسے اپنا پہلا ناول لکھے پانچ برس ہو چکے تھے۔ مگر اس کے ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس طویل قصے میں مصنف نے حیرت انگیز واقعیت اور جامعیت کے ساتھ جنسی لذتوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ خیر یہ تو کچھ زیادہ قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے نظریوں کے جواز میں پیغمبروں اور اوتاروں کی خانگی زندگیوں کو تختۂ مشق بنایا تھا اور یہ ایسی بات تھی کہ کتاب کا شائع ہوتے ہی ضبط ہو جانا یقینی امر تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ کوئی ناشر اسے چھاپنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

کتب فروشوں نے عدیل کو معقول معاوضہ پیش کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ ناول میں سے قابلِ اعتراض حصوں کو حذف کر دو مگر وہ مسودے میں سے ایک نقطہ بھی کاٹنے کو تیار نہ تھا۔ وہ کہا کرتا :

"ایک سچا فن کار ہمیشہ اپنی روح کو تخلیقات میں منتقل کیا کرتا ہے۔ میری روح اچھی ہو

یا بُری میں مادی منفعت کے لیے اسے بدلنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

عدیل کو اپنی اس ضد کے طفیل کافی تنگدست ہونا پڑا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ تصنیف و تالیف کے کام ہی سے بددل ہو گیا تھا۔ جب اس کی ناداری حد سے بڑھ جاتی تو ایک دوست اسے کسی چھاپے خانے سے زیرِ طبع کتابوں کے کچھ پروف پڑھنے کے لیے لادیا کرتا۔ اور اس طرح اسے دو چار روپے مل جایا کرتے۔

عدیل سے فرخندہ کی دوستی سب سے پرانی تھی۔ اب سے کوئی سال بھر پہلے جب وہ اپنے شوہر کی جوانا مرگی کے بعد سسرالی والوں کی سختیوں سے تنگ آکر بھاگ آئی تھی تو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے اس کی ملاقات عدیل ہی سے ہوئی تھی۔ اور عدیل ہی نے اسے اس مکار بڑھیا کے پنجے سے چھڑایا تھا جو اسے کھاتے پیتے گھر میں استانی کی جگہ دلوانے کا لالچ دے کر نکال لائی تھی۔ پھر چونکہ اس کے میکے میں اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار زندہ نہیں تھا جو اس کی معاش کا کفیل ہوتا یہ عدیل ہی تھا جس نے اس کے رہنے سہنے کا انتظام کیا تھا۔ اور اسی کے مشورے سے اس نے قسطوں پر سلائی کی مشین لے کر تکیاں، بٹوے وغیرہ سینے کا کام شروع کیا تھا جو اس نے اسکول میں اپنی ایک شفیق استانی سے سیکھا تھا۔ عدیل ہی نے نہ معلوم کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر بارہ چودہ برس کا ایک ہوشیار سا لڑکا لادیا تھا جو نہ صرف گھر کا اوپر کا کام ہی کیا کرتا تھا بلکہ ہر روز تیسرے پہر اس کی تیار کی ہوئی تکیاں وغیرہ بیچنے بھی جایا کرتا۔ غرض وہ عدیل کی بڑی قدر کرتی اور اسے ملک کا بہت بڑا صناع سمجھتی تھی۔

محسن عدیل کے بعد یا تو بیمہ ایجنٹ بھٹناگر آتا اور یا ڈاکٹر ہمدانی یا دونوں ساتھ ساتھ آتے۔ بھٹناگر ادھیڑ عمر کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ گندمی رنگ، مٹیالے رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا گویا کسی حاصل نہ ہوسکنے

والے مطلب کے بر لانے کے لیے نت نئی چالوں کا تصور پیش رہتا ہے۔ فرخ بھابی کے ہاں آتے ہی وہ اپنی بادامی رنگ کی پتلون اتار کے اور تہہ کرکے ایک کونے میں رکھ دیتا اور ایک پرانی سی دھوتی باندھ لیتا جو اسی مقصد کے لیے اس نے وہاں لاکر رکھ دی تھی جس روز وہ معمول سے کچھ سویرے آجاتا اور فرخندہ ابھی ہنڈیا چولہے ہی میں لگی ہوتی تو وہ کسی سے بات نہ کرتا بس جیب سے تاش کا پیکٹ نکال اکیلا ہی فرش پر بازی لگاتا رہتا۔

انشورنس والے عموماً ہر اس جگہ جانے کے آرزو مند رہا کرتے ہیں یہاں دو چار صورتیں مل جیتی ہوں کہ شاید وہاں کوئی شکار ہاتھ آتے اور بھٹناگر بھی فرخ بھابی کے ایک دوست کے ذریعے اس کے ہاں یہی مقصد لے کر پہنچا تھا۔ مگر یہاں اسے اپنے ڈھب کی کوئی اسامی تو نظر نہ آئی البتہ یہاں کا ماحول اسے ایسا راس آگیا کہ یہ جگہ شام گزارنے کے لیے مستقل طور پر اس کا ٹھکانہ بن گئی۔

ڈاکٹر ہمدانی کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر دیکھنے میں وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، سرخ و سفید چہرہ، ڈاڑھی مونچھ صاف، سر کے بال تقریباً غائب۔ ایک آنکھ پر سنہری زنجیر والا چشمہ لگایا کرتا۔ ململ کا کرتا، بوسکی کا تہمد، پاؤں میں سلیپر، ہاتھ میں موٹی سی چھڑی چاندی کی موٹھ والی۔ سردیوں میں اس لباس میں فقط اس قدر اضافہ ہوتا کہ پشمینے کی ایک خودرنگ چادر کو ایک خاص ڈھب سے تہہ کر، چھاتی پر لپیٹ، بغل سے نکال شانے پر اس طرح ڈال لیتا کہ اس میں ایک بارعب سیاسی لیڈر کی سی ادا پیدا ہو جاتی۔

وہ طب یونانی، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی تینوں میں ماہر سمجھا جاتا تھا گو باقاعدہ طور پر ان میں سے کسی کی سند بھی اس کے پاس نہ تھی۔ اس نے شوقیہ طور پر انسانی روگوں کا مطالعہ کیا تھا اور علاج کے قدیم و جدید تمام اصولوں کو ملا کر ایک نیا طریقہ نکالا تھا جس سے

باعث غیر طبی حلقوں میں اس کی کافی شہرت تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دارالتجارب میں اپنے کو بند کر کے عجیب و غریب اور پر اسرار تجربے کیا کرتا جن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ فرخ بھابی ایک مرتبہ اس کے زیرِ علاج رہ چکی تھی اور یہی اس کی دوستی کی بنا تھی۔

سیڑھیوں میں ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور سب جان لیتے کہ دیپ کمار آ رہا ہے۔ وہ ایک بائیس سالہ خوش رو شرمیلا نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ، گھنگھریالے بال۔ وہ ایک امیر زمیندار کا بیٹا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالسلطنت میں آیا تھا مگر ایم۔اے میں فیل ہونے کے بعد ایسا دل برداشتہ ہوا کہ نہ تو باپ کے بے شمار خطوں اور تاروں کا کوئی جواب دیا اور نہ گھر جانے کا نام ہی لیا۔ اس کا مخصوص لباس یہ تھا، کھدر کا کرتا، کھدر کا پاجامہ، پیروں میں چپل اور سر سے ننگا۔ سردیوں میں ایک سیاہ کمبل جس کے حاشیے پر سرخ سرخ ڈورے تھے، اوڑھ لیا کرتا۔ باپ کی نشانی یہی ایک کمبل اس کے پاس رہ گیا تھا۔

اسے فرخندہ کے ہاں عدیل لایا تھا۔ فرخندہ نے پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہا تھا: "آپ کے لیے فلم لائن بہت موزوں رہے گی۔" یہ سن کر اس کے رخسار کانوں تک تمتما اٹھے تھے۔ کوئی مہینے بھر کے بعد جب وہ فرخندہ سے کسی قدر بے تکلف ہو گیا تو ایک دن جھجکتے ہوئے پوچھا:

"فرخ بھابی کیا میں سچ مچ فلم لائن کے لیے موزوں ہوں؟"

فرخندہ مسکرا دی:

"تو کیا اس دن آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہوا تھا؟"

دیپ کمار یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا اور پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

عدیل، بھٹناگر، ڈاکٹر ہمدانی اور دیپ کمار کے آ جانے سے اب محفل خاصی سج جاتی۔ اُدھر فرخندہ بھی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر محفل میں آ بیٹھتی۔ علاوہ ازیں "مولانا" جو آٹھوں پہر فرخندہ ہی کے ہاں پڑے رہتے تھے اور زیادہ تر وقت سونے میں گزارتے تھے اپنی کملی سنبھالتے ہوئے آ کر محفل میں شریک ہو جاتے۔

نام تو خدا جانے ان کا کیا تھا مگر سب انہیں "مولانا" کہا کرتے تھے۔ یہ مقدس خطاب دلوانے میں ان کی بزرگی یا دین داری سے کہیں زیادہ ان کی کرّبڑی ڈاڑھی نے حصہ لیا تھا۔ گلوں پر تو بال خال خال تھے البتہ ٹھوڑی خوب بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ناک پتلی اور ستواں، کان بڑے بڑے۔ کہتے تھے مسجد کے ملاّں نے کھینچ کھینچ کر بڑے کر دیے تھے۔

یہ حضرت دیہات کے رہنے والے تھے۔ ادھیڑ عمر میں علم دین کی تکمیل کا شوق چرایا اور یہ اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ شہر پہنچے۔ کچھ دنوں مختلف مسجدوں میں فقہ حدیث وغیرہ کا درس لیتے رہے۔ پھر ایک مسجد میں امام بنا دیے گئے جو ٹوٹی ہوئی اور شہر سے دُور ایک اجاڑ سے مقام میں تھی۔ مسجد کے قریب ہی سے ریل کی لائن گزرتی تھی۔ نمازی تو اس مسجد میں شاذ ہی کبھی آتا البتہ ریل گاڑیاں دن رات گزرا کرتیں۔ مولانا دن بھر حجرے میں اپنی جھلنگی چارپائی پر پڑے حجرے کے شگاف میں سے آنے جانے والی گاڑیوں کی سواریوں کو اداسی سے دیکھتے رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے جمعہ کپڑے دھو کر شہر کی جامع مسجد میں جایا کرتے جہاں ایک مشہور عالم دین جمعہ کی نماز سے پہلے وعظ کیا کرتے۔ ایک دن وہ وعظ کو جانے لگے تو اپنی ساری درسی کتابیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ پورے دو گھنٹے تک وہ حضوری قلب کے ساتھ عالم صاحب کا وعظ سنتے رہے۔ جب وعظ ختم ہوا تو وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ مسجد سے نکل کر انہوں نے اپنی ساری کتابیں ایک نادار طالب علم

کو دے دیں۔ اس کے بعد پھر کسی نے ان کو کسی مسجد یا درس میں نہیں دیکھا۔

فرخندہ سے ان کی ملاقات یوں ہوئی کہ پچھلے سال جاڑوں کی ایک شام کو وہ ایک بازار سے گزر رہی تھی کہ اس نے دیکھا، ایک شخص کمبل اوڑھے سرکاری نل کے کنارے بیٹھا زور زور سے کانپ رہا ہے۔ وہ ٹھہر گئی۔ اس پر اس شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"میں بیمار ہوں۔ اس شہر میں میرا کوئی نہیں۔ میں بچوں کو کلام مجید پڑھا سکتا ہوں۔ اگر کہیں کام مل جائے . . . . ."

غرض فرخندہ انہیں گھر لے آئی۔ چھ سات روز میں وہ بالکل تندرست ہو گئے۔ مگر وہ دن اور آج کا دن۔ نہ تو انہوں نے بچوں کو کلام مجید پڑھانے کا کبھی ذکر کیا اور نہ فرخندہ کے ہاں سے جانے کا نام ہی لیا۔ وہ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتے۔ مثلاً برتن مانجھ دیے، چولہے میں آگ سلگا دی، کنوئیں سے پانی بھر لائے اور اگر کبھی فرخندہ کے سر میں درد ہوتا تو دیر تک اس کی پیشانی کو دباتے اور آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہتے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی فرخندہ کے دوستوں کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیا کرتے۔ مگر ہمیشہ ناخوشی کے ساتھ۔ وہ سب کے سب ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

زیادہ دیر نہ ہونے پائی کہ نوجوان انقلابی شاعر شکیبی بھی آ پہنچا۔ وہ تھا تو جلد ساز مگر طبعِ موزوں رکھتا تھا۔ نفسیات کے ایک پروفیسر کی صحبت نے جو اس سے جلدیں بندھوایا کرتا تھا اسے شاعر بنا دیا تھا۔ شکیبی کا تخلص اسی کا رہینِ منت تھا۔ چیچک رو تھا مگر آواز خدا کی دین ہے، جس وقت لہک لہک کے اپنا کلام سناتا تو اپنی کم روئی اور خستہ حالی کے باوجود ایک خاص طرح کا حسن اور بھول پن اس کے چہرے پر برسنے لگتا۔ اس نے مزدوروں کے متعلق متعدد نظمیں لکھی تھیں۔ ہر چند ان میں عروض و محاورہ کی غلطیاں جا بجا

پائی جاتی تھیں مگر جو ان میں سے بعض واقعی معرکہ کی تھیں۔ خصوصاً وہ نظم جس میں ایک مزدور اپنی شادی کے روز حجام سے خط بنوانے جاتا ہے۔ اس کی بے تابی کا یہ عالم ہے کہ پے در پے استرے کے زخم کھاتا ہے اور بالآخر اپنا نصف نچلا ہونٹ ہی کٹوا بیٹھتا ہے، حقیقت نگاری اور انقلابی مزاج کی عمدہ ترین مثال تھی۔

یہ محفل اپنے عروج پر نہیں پہنچتی تھی جب تک کہ قاسم نہ آ پہنچتا۔ وہ ٹرام کمپنی میں کرایہ اگاہنے پر ملازم تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک افسانہ نویس بھی تھا۔ اس نے ٹرام کی نوکری محض بیکاری کی وجہ سے کی تھی۔ مگر دو چار ہی روز میں جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کے ذریعے اسے انسانی کردار کے مطالعے کا، جو اس کی افسانہ نویسی کے لیے ازبس ضروری تھا، کس قدر نادر موقع ملتا ہے تو اسے اس کام سے بے حد دلبستگی ہو گئی۔ چنانچہ جب بعد میں ایک دوست نے اس کے لیے کسی اور جگہ بہتر ملازمت تلاش کی تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ ٹرام میں اس کی مڈبھیڑ اس قدر گوناگوں انسانوں سے ہوتی تھی کہ نہ تو ریل میں ممکن ہے اور نہ جہاز میں کیونکہ ان کے مسافر عموماً لمبے لمبے سفر کرتے ہیں۔ مگر ٹرام میں ہر پاؤ میل کے بعد پوری کھیپ کی کھیپ نئے مسافروں کی لے لیجیے۔

وہ دراز قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ ٹرام کی میلی اور پھٹی ہوئی وردی میں بھی وہ ایک فوجی کی سی شان رکھتا تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ تھا۔ دوپہر کو تنور پر کوچوانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتا اور شام کو ٹرام کے ایک اسٹیشن کے قریب سے نان کباب خرید لاتا اور چلتی گاڑی میں کھڑے کھڑے کھا لیتا۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرام رکتی تو سرکاری نل سے پیٹ بھر کر پانی پی لیتا۔ غرض بہت مرنجاں مرنج آدمی تھا۔

قاسم اور شکیبی، محسن عدیل کے دوستوں میں سے تھے اور پہلے پہل اسی کے ذریعے

فرخ بھابی کے ہاں آئے تھے۔ یہ سب لوگ محفل کے خاص رکن تھے اور قریب قریب ہر روز کے آنے والے۔ ان کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی تھے۔ مگر ان کے آنے کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ جب آنے لگتے تو متواتر کئی کئی دن آتے رہتے اور جب نہ آتے تو مہینوں شکل نہ دکھاتے۔

ان میں ایک صاحب تھے مسٹر سنگھا جو ایک باکمال مصوّر اور فوٹو گرافر تھے مگر اپنے فن سے فائدہ اٹھانا ان کی قسمت میں نہ تھا کیونکہ نہ کبھی کوئی اسٹوڈیو نصیب ہوا اور نہ کبھی کوئی بڑھیا سا کیمرہ خریدنے کی توفیق ہوئی۔ چنانچہ کبھی ادنیٰ تھیئٹریکل کمپنیوں کے پردے رنگ کر تو کبھی دوکانوں کے سائن بورڈ لکھ کر گزارہ کرتے۔ ان کی یہ بڑی تمنا تھی کہ وہ فرخ بھابی کی ایک ایسی تصویر کھینچیں جس میں وہ فوجی وردی پہنے گھوڑے پر سوار ہو۔ وہ کئی مرتبہ اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ مگر یہ تمنا پوری ہونے میں نہ آتی تھی۔

کبھی کبھی ایک خان صاحب بھی، مان نہ مان میں تیرا مہمان کے مصداق، آجایا کرتے، وہ کبھی تھانے دار رہ چکے تھے مگر کسی بے اعتدالی کے باعث معطل کر دیے گئے تھے۔ شملے دار پگڑی کلاہ پر بندھی ہوئی، مونچھوں کو بل دیا ہوا، سُرخ سُرخ آنکھیں، ہاتھ میں پتلی سی بید کی چھڑی جسے عادتاً لرزاتے رہتے، پاؤں میں پشاوری چپل۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کس طرح گزر کیا کرتے تھے۔ مگر جب آتے پیئے ہوئے آتے اور آتے ہی فرمائش شروع کر دیتے:

"فرخندہ خانم کبھی گانا نہ سنایا تم نے!"

"ایلو اور سنو،" فرخندہ جواب دیتی "یہ کس نے کہہ دیا آپ سے کہ میں گاتی ہوں؟"

"واللہ تم ضرور گاتی ہو اور آج ہم بے سنے نہ جائیں گے۔"

"خان صاحب! آپ باور کریں، میں گانا بالکل نہیں جانتی۔"

"فرخندہ خانم! تمہاری آواز واللہ بے حد رسیلی ہے۔ تم گایا کرو۔ سکھانے کا بندوبست ہم کر دیں گے۔"

"جی شکریہ!"

"بہت اچھا گویا ہے آجکل ہمارے ہاتھ میں۔"

"لو بھلا اس عمر میں مَیں کیا سیکھوں گی گانا۔"

"سینما کے پاس ہیں ریزرو کلاس کے۔ چلتی ہو فلم دیکھنے؟ چاہو تو مولانا کو بھی ساتھ لے چلو۔"

"جی مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ ہاں مولانا جانا چاہیں تو انہیں شوق سے لے جائیے۔"

پھر وہ لمحہ بھر تامل کر کے حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فرخندہ سے دبی آواز میں پوچھتے:

"کھانا تو تم لوگ کھا چکے ہو گے؟"

"ہاں مدت ہوئی۔"

"اچھا تو ایک پان کھلاؤ اور ہم چلیں۔"

ان خاں صاحب کا آنا فرخندہ کے سب دوستوں کو بُرا لگتا۔ مگر وہ خاموش اور الگ تھلگ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے۔ آخر خدا خدا کر کے جب وہ رخصت ہوتے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیتے۔

جب یہ محفل بھر جاتی تو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اس کے لیے کسی خاص موضوع کی پابندی نہ تھی۔ عام طور پر کسی اخبار کے ضمیمہ کی خبر، قتل یا لوٹ مار کا کوئی واقعہ، کسی مغنیہ کی آمد یا کسی لیڈر کا اغوا، مچھر وغیرہ گفتگو کے آغاز کا باعث ہوتے۔ شروع شروع میں بات چیت دو ایک آدمیوں ہی تک محدود رہتی۔ مگر جلد ہی کوئی صاحب موضوع میں

تھوڑی سی ترمیم کر کے شریک ہو جاتے۔ باتوں باتوں میں کوئی واقعہ مثال کے طور پر سنایا جا رہا ہوتا تو سامعین میں سے کسی اور صاحب کو ویسا ہی یا اس سے ملتا جلتا واقعہ یاد آجاتا جسے وہ سنائے بغیر نہ رہتے۔ اسی طرح کسی صاحب کو بات کا کوئی پہلو کھٹکتا جس کی تردید کرنا وہ ضروری سمجھتے۔ غرض یوں رفتہ رفتہ سبھی لوگ گفتگو میں حصہ لینے لگتے۔

بعض اوقات گفتگو شروع ہی سے عالمانہ رنگ اختیار کر لیتی۔ ایسے موقعوں پر قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں دہرائی جاتیں۔ تاریخ کے لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی کی جاتی۔ حکمرانوں اور جہاں بانوں کی حکمتِ عملیوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ اقتصادیات، عمرانیات، نفسیات اور حیات بعد الممات پر خیال آرائیاں ہوتیں۔ اور فرخندہ انتہائی غور و خوض کے ساتھ اپنے رفیقوں کی تقریروں کو سنتی رہتی۔ ہرچند بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالا ہوتیں مگر اس سے اس کے انہماک میں ذرا فرق نہ آتا۔ وہ دل ہی دل میں ان کی قابلیت اور وسعتِ معلومات پر عش عش کر اٹھتی۔ اور جب اسے یہ خیال آتا کہ علم و فضل کے یہ دریا اس کے چھوٹے سے ناچیز گھر میں بہائے جا رہے ہیں تو اس کی آنکھوں کی قدرتی چمک دوچند ہو جاتی اور اُس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا۔

کبھی کبھی جادو اور دوسرے سفلی علوم پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا۔ صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے ذکر سے اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ اس گفتگو میں سب سے زیادہ جوش و خروش سے حصہ مولانا لیا کرتے۔ ان کا قول تھا کہ موجودہ تہذیب کی بے چینیوں اور ناانصافیوں کو دُور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان سے بالا و برتر قوتوں پر قابو حاصل کیا جائے اور ان کی مدد سے دنیا میں انصاف، بھائی بندی اور امن قائم کیا جائے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے، خدا جانے اس میں کہاں تک سچ ہے، کہ کم و بیش تمام قدیم تہذیبوں کے عروج و ترقی میں سفلی علوم کو بہت دخل رہا ہے۔

"مولانا صاحب!" ڈاکٹر ہمدانی پوچھتا۔ "کیا جن و ملک آج بھی دنیا میں موجود ہیں؟"

"ہیں کیوں نہیں!"

"پھر وہ نظر کیوں نہیں آتے؟"

"اس لیے کہ انسان کے حواس کا ارتقا اس قدر کامل نہیں ہوتا کہ وہ جن و ملک کا، جن کی روح انسان کی روح سے ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے، ادراک کر سکے۔"

"حواس کا کامل ارتقا کیسے ہوتا ہے؟" محسن عدیل دریافت کرتا۔

"سخت ریاضت اور قوتِ ارادی سے۔" مولانا جواب دیتے۔

"کیا کبھی آپ کو بھی جن نظر آیا؟" بھٹناگر پوچھتا۔

"آیا کیوں نہیں،" مولانا شگفتگی سے فرماتے۔ "لیکن بھئی صرف ایک بار۔"

اس کے بعد وہ مزے میں آ کر اس زمانے کا ایک واقعہ سنانا شروع کرتے جب ریلوے لائن کے پاس ٹوٹی ہوئی مسجد میں رہتے تھے اور انہیں سفلی علوم کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ابھی ان کا جن طہارت کے لسٹے میں سے آدھا ہی نکلنے پاتا کہ فرخندہ جو کچھ لمحے پہلے چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی واپس آ جاتی اور مولانا کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہتی:

"اجی مولانا صاحب قبلہ! یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، ذرا جا کر مسجد سے گھڑا تو بھر لائیے۔"

"لیکن وہ پانی کیا ہوا جو میں شام کو بھر کر لایا تھا؟" مولانا پوچھتے۔

بھٹناگر بول اٹھتا:

"آپ کا کوئی یارِ غار جن آ کر پی گیا ہوگا۔" اور اس پہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا۔

"بات یہ ہے مولانا صاحب!" فرخندہ بیان کرتی۔ "اس میں جھینگر مرا پڑا تھا۔ میں

نے لے کے سارا پانی لنڈھا دیا۔ جائیے جائیے میرے اچھے مولانا صاحب! ابھی تو مسجد کا دروازہ کھلا ہوگا، بند ہو گیا تو رات بھر سب کے سب پیاسے مریں گے۔"

اس وقت جب کہ وہ محیر العقول چشم دید واقعہ سنا رہے ہوتے انہیں یوں بات کو ادھو بیچ میں چھوڑ کے جانا سخت ناگوار گزرتا۔ گھڑے تک پہنچنے اور پھر اسے اٹھا کر سیڑھیاں اترنے میں تو انہیں خاصا وقت لگ جاتا مگر ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے ہی ان میں یک لخت چستی پیدا ہو جاتی۔ یہ امید کہ شاید وہ واپس آکر قصے کا سلسلہ اسی جگہ سے دوبارہ شروع کر سکیں جہاں اچانک اسے منقطع کر دیا گیا تھا، انہیں تیزی سے مسجد میں پہنچا دیتی اور وہ جلد از جلد کنوئیں سے پانی نکالنا شروع کر دیتے۔ مگر آخر جب وہ گھڑا بھر کر گھر پہنچتے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پاتے۔ جہاں پہلے روحانیت کے اثر سے فضا میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ کا سا گمان ہونے لگتا تھا وہاں اب نغمے لرز رہے تھے۔

نوجوان انقلابی شاعر شکیبی اپنی نظم "سرخ برکھا" سینتالیسویں بار ترنم سے سنا رہا تھا۔ یہ نظم کافی طویل تھی اور فرخ بھابی کو حد سے زیادہ مرغوب۔ مولانا کا دل ٹوٹ جاتا اور اس رات وہ پھر کسی سے بات نہ کرتے اور جلد ہی کملی تان کے پڑ رہتے۔

اس محفل میں آئے دن اہم ملکی و معاشرتی مسائل پر گرما گرم بحثیں تو ہوا ہی کرتی تھیں مگر اس شام اہلِ مجلس کا جوش و خروش خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتا جب کوئی صاحب کوئی نئی تجویز لے کر آتے۔ مثلاً ملک کی صحافت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ صحیح معنوں میں کوئی معقول روزانہ اخبار نکالا جائے۔ مگر معقولیت کے لیے چونکہ مالی ذرائع کا وسیع ہونا ضروری تھا اس لیے فی الحال صرف ایک پیسے والے ضمیمہ ہی پر اکتفا کیا جاتا۔ اس کا کچھ زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔ یہی بیس پچیس روپے

روزمہ اتنے کے تو صرف سینما ہی کے اشتہار فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ مگر نہ معلوم کام کی زیادتی کی وجہ سے یا ہر روز کی ذمہ داری کے خیال سے اس تجویز کا خیر مقدم زیادہ گرمجوشی سے نہ کیا جاتا اور روزانہ اخبار کی اسکیم جلد ہی ہفتہ وار اور ہفتہ وار سے ماہانہ رسالے میں بدل جاتی۔ اس پر نئے سرے سے خرچ کی میزان جوڑی جاتی۔ رسالے کا نام اور اس کے اغراض و مقاصد تجویز کرنے پر کافی بحثا بحثی ہوتی۔ رسالے کی ادارت کسی ایک صاحب کے سپرد نہیں کی جا سکتی بلکہ ایک پورا بورڈ اس کام کے لیے مقرر کرنا پڑے گا۔ بجٹنا گر اپنے انشورنس کے کام کے ساتھ ساتھ رسالے کے لیے کنویسنگ بھی کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر ہمدانی اپنے مریضوں میں توسیعِ اشاعت کی کوشش کرے گا۔ نیز رسالے کے خریداروں کو اس کے ہاں کی ادویہ رعایتی قیمت پر دستیاب ہو سکیں گی۔ مقامی پروپیگنڈے کا کام ٹرام کے کنڈکٹر قاسم اور نوجوان انقلابی شاعر شکیبی کے سپرد ہو گا۔ رسالے کے سرورق اور اس کی ظاہری زیبائش کے لیے مسٹر سنگھا کی خدمات لی جائیں گی۔ رسالے کے دفتر کے لیے کچھ زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں۔ اس مطلب کے لیے بھلا فرخ بھائی کے گھر سے زیادہ موزوں جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے . . . . غرض یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے اور اراکینِ مجلس کے شوق و گرم جوشی کو دیکھ کر گمان ہونے لگتا کہ بس ہفتے عشرے تک رسالہ نکلا ہی چاہتا ہے۔ مگر آخر میں ڈیکلریشن داخل کرنے کا کام کچھ ایسا بے ڈھب ثابت ہوتا کہ رسالے کی اشاعت برابر معرضِ تعویق میں پڑتی جاتی اور کچھ دنوں کے بعد یہ تجویز پرانی ہو کر اپنی ساری دل کشی کھو بیٹھتی۔

اسی طرح کبھی اس قسم کی تجویز ہوتی کہ اہلِ وطن کی صحت ناقص غذا کے باعث روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے لیے وسیع پیمانے پر خالص دودھ اور گھی مہیا کیا جائے۔ یعنی ایک ڈیری فارم کھولا جائے۔ مگر سرمایے کی کمی اور فارم کی

اہم ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوتے اس سکیم میں بھی بار بار ترمیمیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ گائیں بھینسیں چھوٹی ہوتے ہوتے مرغیوں کی شکل اختیار کر لیتیں اور آخر میں کوئی صاحب مرغیوں کی کسی متعدی بیماری کا ذکر کر کے سب کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتے۔

ایسا ہی حشر ٹکا لانڈری، کھادی بھنڈار اور غریبوں کے ہوٹل کا ہوا۔

کسی کسی روز خصوصاً سخت سردی کی راتوں میں یہ مجلس خالص تفریحی بھی ہوا کرتی۔ اس شب تمام گفتگوؤں اور بحث مباحثوں کو بالائے طاق رکھ کر تاش کھیلا جاتا، عموماً ایک ہی کھیل غلام چور، جس میں ہر دفعہ چور کے لیے نرالی سے نرالی سزا تجویز کی جاتی۔

اس کھیل کی ابتدا یوں ہوتی کہ محفل میں ایک بارگی کسی صاحب کو سخت جاڑا لگنے لگتا۔ چنانچہ فرخ بھائی کے بستر سے اس کا ریشمی لحاف منگوایا جاتا جسے چاروں طرف پھیلا کر سب لوگ اپنی اپنی ٹانگوں پر لے لیتے۔ پھر کوئی صاحب چپکے سے جٹنا گر کے کوٹ کی جیب میں سے تاش نکال لیتے اور کسی سے پوچھے گچھے بغیر لحاف ہی پر سب کو پتے بانٹنے شروع کر دیتے۔ چنانچہ اس طرح بغیر کسی تمہید کے کھیل شروع ہو جاتا۔ اور جب تک لالٹین میں تیل ختم نہ ہو جاتا برابر جاری رہتا۔ بعض دفعہ اذانیں تک سنائی دے دے گئیں۔ اس رات تاش کے ساتھ ساتھ مونگ پھلی بھی خوب کھائی جاتی۔ چنانچہ فرش پر، لحاف پر، پتلون کی جیبوں میں، پاجامے کے نیفے میں غرض جس جگہ دیکھو مونگ پھلی کے چھلکے ہی چھلکے ہاتھ آتے۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہر چند فرخ بھائی کے دوستوں کی بے دینی کفر و الحاد کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ مولانا بھی اپنے بعض عقاید کی بنا پر سخت گمراہ سمجھے جاتے تھے، مگر وہ دینی معاملوں میں بڑی کٹر تھی۔ یہ ایک ایسا امر تھا جس میں اس کے دوستوں کے فعل اور کردار اس پر کچھ اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ وہ سختی سے صوم و صلوٰۃ

کی پابند تھی۔ ایسا تو کبھی ہوا کہ اس نے کسی وقت کی نماز قضا پڑھ لی ہو، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس نے چھوڑ ہی دی ہو۔ جب نماز کا وقت ہوتا وہ چپکے سے اُٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی جاتی اور فریضہ ادا کر کے چلی آتی۔ کبھی کبھی وہ محفل ہی میں بیٹھی دوپٹے کے نیچے تسبیح پھیرتی رہتی اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپی سے کھیل اور کھلاڑیوں کو بھی دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔

(۲)

کہتے ہیں جب کسی پر بُرا وقت آتا ہے تو خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔

جنوری کی ایک صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ فرخندہ کی آنکھ کھل گئی۔ یوں تو وہ نماز کے لیے ہر روز منہ اندھیرے اُٹھنے کی عادی تھی مگر اس روز ابھی کچھ زیادہ ہی رات باقی تھی۔ دراصل اسے سوتے سوتے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے اپنی کوٹھڑی کے باہر دالان میں کچھ کھڑکا سا سُنا ہو، اور وہ چونک اٹھی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو، پھر اسے مولانا اور ملازم لڑکے کا خیال آیا جو ساتھ والی کوٹھڑی میں سویا کرتے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی کسی ضرورت سے باہر نکلا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند نہ آئی۔ اس نے دل میں کہا، کیوں نہ آواز دے کر ان لوگوں سے پوچھ لوں۔ چنانچہ اس نے لیٹے ہی لیٹے پکار کر کہا:

"مولانا صاحب! اجی مولانا صاحب‘ . . . غفار، ارے او غفار!"

مگر دونوں میں سے کسی نے بھی رسید نہ دی - اس نے سوچا، کوٹھڑی کا دروازہ بند ہے، اس پر یہ لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے، میری آواز بھلا کہاں سنائی دی ہو گی - پھر خیال آیا، ان میں سے اگر کوئی باہر نکلا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ سو نہیں گیا ہو گا - جی تو ابھی گرم گرم بستر سے نکلنے کو نہیں چاہتا تھا مگر ظن جو بیٹھ چکا تھا - مجبوراً اٹھی - سرہانے کی کھونٹی پر سے گرم چادر اتار لی اوڑھ لی - پھر لالٹین روشن کی - اسے ہاتھ میں تھام کوٹھڑی کی کنڈی کھول باہر نکلی -

باہر اس وقت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور ہوا اتنی کہ زناٹے سے چل رہی تھی - دانتوں کو بھینچ کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی، سمٹتی سمٹاتی دوسری کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچی -

"مولانا صاحب! اجی مولانا صاحب!" اس نے پکار کر کہا -

مگر مولانا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا - دروازے کو ہاتھ لگانا تھا کہ کواڑ ایک دم سے "چی یوں" کر کے کھل گئے - وہ کچھ ڈر سی گئی - مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کیا اور جس ہاتھ میں لالٹین تھی اسے اونچا کر کے کوٹھڑی میں داخل ہو گئی - لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ مولانا تو حسبِ معمول فرش پر اپنی کملی میں گٹھڑی سی بنے پڑے ہیں مگر ملازم لڑکا غفار موجود نہیں - نہ اس کا بستر ہی اسے نظر آیا - معاً اسے اپنی سلائی کی مشین کا خیال آیا جو اسی کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑی رہا کرتی تھی اور اس کی نظریں آپ سے آپ اس کونے کی طرف اٹھ گئیں - اس کا دل دھک سے رہ گیا ــــ مشین وہاں نہیں تھی -

"مولانا صاحب! مولانا صاحب!" اس نے مولانا کو جھنجھوڑتے ہوئے پُر اضطراب لہجے میں کہا "اٹھیے اٹھیے - چوری ہو گئی -"

"ایں چوری ہوگئی؟" مولانا آخر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ "کب؟ کس کے ہاں؟" اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرخندہ کا منہ تکنے لگا۔

"ہمارے ہاں اور کس کے؟" فرخندہ نے کہا۔ "غفار میری سلائی کی نئی مشین چرا لے گیا۔"

"غفار؟"

"ہاں وہی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا!"

"تو پھر کہاں ہے وہ؟ بستر بھی تو نہیں ہے اس کا۔"

اس کے جواب میں مولانا نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو پھرا کر کوٹھڑی کا جائزہ لیا پھر لمحہ بھر خاموش رہے پھر وہ بڑبڑائے:

"ہات تیرے مردود کی!"

"ابھی اس کی آدھی قسطیں بھی تو میں نے ادا نہیں کی تھیں۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ مجھے کئی دنوں سے اس کے طور بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دو ایک بار خیال بھی آیا کہ رات کو مشین اپنے کمرے میں رکھوا لیا کروں۔ مگر ایک تو اس میں جگہ ہی کہاں تھی، دوسرے آپ پر بھروسہ تھا کہ آپ یہاں سوتے ہیں، دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔"

مولانا کچھ دیر قصور واروں کی طرح گردن جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ علاوہ ازیں ابھی اعضا پر نیند کا کچھ کچھ اثر باقی تھا۔ اچانک انہوں نے جھرجھری لی اور بولے:

"فرخ بھابی! فکر نہ کرو مشین کہیں نہیں جا سکتی۔ اللہ نے چاہا تو کل ہی پکڑا جائے گا مردود۔"

"میں سو رہی تھی کہ کھڑکا سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی ابھی لے گیا ہے۔ کچھ دور

نہیں گیا ہوگا۔ ہائے ہوتا کوئی ہمت والا، ابھی جا کر اسے پکڑ لاتا۔"

"گھبراؤ نہیں، میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں۔" اچانک مولانا کی مردانگی نے جوش مارا۔ مگر باہر اس وقت ایسی ہمت شکن سردی پڑ رہی تھی کہ فوراً ان کو اپنے اس ارادے میں ترمیم کرنی پڑی۔

"پکڑ تو میں اسے ضرور لاؤں گا" وہ بولے "پاتال میں ہوگا، پاتال سے بھی کان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آؤں گا۔ مگر ذرا دن نکل آئے۔ اس وقت اندھیرے میں کہیں چھپ گیا تو نظر تھوڑا ہی آئے گا سوئر کا بچہ۔"

"بس رہنے دو مولانا صاحب" فرخندہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "اس وقت آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ صبح کو میں خود ہی کسی کو تھانے بھیج کر رپٹ لکھوا دوں گی۔"

مولانا کو اپنے معقول عذر کے جواب میں یہ سرد مہرانہ کلام سننے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انہوں نے تکیے کے نیچے سے اپنی پگڑی نکالی، دو ایک دفعہ اسے جھٹکا اور پھر سر پر باندھ لیا۔ پھر کمبل جھاڑ اس کی بکل ماری اور جوتی پہن کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ ٹھٹھرتے ہوئے واپس آئے۔ اس اثناء میں فرخندہ غم سے نڈھال، اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ رہی تھی۔

"میں سارے میں دیکھ آیا مزدور کو" وہ فرخندہ کے پلنگ کے پاس آ کر کہنے لگے۔ "پہلے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سارے مسافر خانے دیکھ ڈالے۔ ایک ایک قلی سے پوچھا۔ جب کہیں نظر نہ آیا تو وہاں سے سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ ایک لاری میں دو مسافر سو رہے تھے۔ باقی سب خالی پڑی تھیں۔ پھر ادھر سے باغ میں دیکھتا بھالتا پتھر والی سرائے میں آیا مگر وہاں بھی اس مردود کا کھوج نہ ملا۔ . . . . بی بی تم فکر نہ کرو۔

تمہاری مشین کہیں جا نہیں سکتی۔ راستے میں مجھے جتنے سپاہی اور چوکیدار ملے میں نے سب کو اس کا حلیہ بتا دیا ہے۔ میرے مولا نے چاہا تو آپ ہی آپ پکڑا ہوا آئے گا، نامراد!"

فرخندہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر اب مولانا نے بھی اس کی ضرورت دیکھی اور وہ اپنی کوٹھڑی میں آ کر پہلے کی طرح دراز ہو گئے۔

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں نے اس چوری کا حال سنا تو سب کو انتہائی افسوس ہوا۔ خاص طور پر محسن عدیل کو سخت رنج اور غصہ تھا کیونکہ اس لڑکے کو لانے اور فرخندہ کے ہاں رکھوانے کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ اس نے فرخندہ کو تسلین دیتے ہوئے کہا:

"بھابی، فکر نہ کریں میں غفار کے باپ کو جانتا ہوں اور مجھے اس گاؤں کا بھی پتا ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ اگر دو چار دن میں اس کا سراغ نہ ملا تو میں خود اس گاؤں میں جاؤں گا اور اس کا کھوج نکالوں گا۔"

دن میں تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی تھی۔ چنانچہ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے ایک بے وردی حوالدار ایک سپاہی کو ساتھ لے کر موقع واردات کا معائنہ کر گیا تھا۔ فی الحال اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ سب نے فرخ بھابی کو صبر کی تلقین کی اور یقین دلایا کہ ہم میں سے ہر ایک ہر روز شہر کے مختلف حصوں کا چکر لگائے گا اور جہاں جہاں درزیوں کی دکانیں ہیں ان سب سے پوچھ گچھ کرے گا۔ فرخندہ کے دوستوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ غفار مشین لے کر شہر سے باہر نہیں جا سکتا کیونکہ خفیہ پولیس والے اسٹیشن اور شہر کے ناکوں کی کڑی نگرانی کرتے ہیں اور جہاں کسی مشتبہ آدمی کو کوئی قیمتی چیز لے جاتے دیکھتے ہیں وہیں روک لیتے اور تحقیقات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گمان غالب یہی ہے کہ اس نے چوری سے پہلے ہی کسی درزی سے بات طے کر رکھی ہوگی۔

فرخندہ گم سم بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس چوری سے اسے سخت دھکا لگا تھا۔ مشین کیا گئی گویا روزی کا دھندا ہی جاتا رہا تھا۔ اب نکٹائیاں اور بٹوے سینے تو کس سے۔ علاوہ ازیں جو کچھ سٹاک پہلے کا اس کے پاس تیار تھا اس کے نکاس کی بھی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ مستقبل کے خیال نے اسے دن بھر ایسا مغموم اور پریشان رکھا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جب اس کے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اسے سمجھانے لگے۔

"واہ فرخ بھابی واہ!" قاسم نے کہا "تم نے تو حد کر دی۔ مَیں تمہیں اتنے کمزور دل کی نہ سمجھتا تھا۔ ایسے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ انسان اپنے کو بھوکوں مار ڈالے۔"

"فرخ بھابی!" انشورنس ایجنٹ بٹنا گر نے کہا "اوّل تو پوری امید ہے کہ تمہاری مشین مل جائے گی لیکن فرض کرو اگر نہ ملی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر میں کسی اور مشین کا انتظام کر دوں گا۔ بس اب مطلق غم نہ کرو۔ اٹھو کھانا کھاؤ۔ مولانا صاحب! دسترخوان بچھائیے!"

"دسترخوان بچھ کر کیا کرے گا۔ کچھ پکا بھی ہو" مولانا نے کہا۔

"ارے بھئی گھر میں کچھ نہیں پکا تو بازار تو نہیں اُجڑ گیا" بٹنا گر نے یہ کہتے کہتے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال ایک نئی چمکدار اٹھنی نکالی۔

"بھئی کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے میرے پاس بھی ہیں" قاسم نے کہا۔ اور اپنی قمیص کی جیب سے ریزگاری نکالی۔ اس میں ایک دوتی، دو اکنیاں، چار ادھنے اور تین پیسے تھے۔

"ایک دوتی میرے پاس بھی ہے" نوجوان انقلابی شاعر شکیبی نے اپنی شیروانی

کی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔" اگر گر نہیں گئی تو ..... نہیں گری نہیں۔ یہ رہی "
غرض بازار سے سالن روٹی اور کباب وغیرہ منگوائے گئے اور روز کی طرح دسترخوان سجایا گیا۔ اور سب کھانے میں شریک ہوئے۔ فرخ بھابی نے بڑے اصرار اور قسمیں دلانے کے بعد صرف چند لقمے کھائے اور اٹھ گئی۔
اس شام محفل خاصی اداس اور بے رونق رہی۔ اور سب لوگ جلد ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اس واقعہ کو چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں نہ تو غفار ہی کا کچھ پتا چلا اور نہ نکٹائیاں اور بٹوے وغیرہ بیچنے کے لیے کسی دوسرے آدمی کا انتظام ہی ہو سکا۔ علاوہ ازیں بھٹناگر نے دوسری مشین لانے کا جو وعدہ کر لیا تھا وہ بھی کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ فرخندہ نے اپنی پہلے دن کی کمزوری کے بعد اپنا غم پھر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ دوسرے روز سے اس کے ہاں پھر سے دونوں وقت چولہا جلنے لگا تھا۔ کچھ تو وہ پکا لیتی اور کچھ اس کے دوست لے آتے اور وہ پہلے کی طرح سب کے ساتھ مل کر کھا لیتی۔ کبھی کبھی وہ ہنس بول بھی لیتی۔ مگر دل ہی دل میں خوب سمجھتی تھی کہ اس حالت میں کے دن گزر ہو سکے گی۔
ساتویں روز سہ پہر کو جب گھر میں اس کے اور مولانا کے سوا اور کوئی نہ تھا تو اس نے مولانا سے بڑی لجاجت سے کہا: "مولانا صاحب! مجھے ابھی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جب تک دوسرے لڑکے کا انتظام نہیں ہو جاتا، میری نکٹائیاں اور بٹوے آپ بازار لے جائیں۔ تو کیسا رہے؟"
مولانا نے ایسی نظروں سے فرخندہ کی طرف دیکھا گویا یہ بات ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔

"میرے اچھے مولانا صاحب! آپ لے جائیں گے نا؟"
"بھئی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا نہیں۔"
"واہ۔ اس میں کون مشکل بات ہے۔ نکٹائیاں لے کر نکڑ پر کھڑے ہو جائیے۔ بولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی دیکھنے کو ٹھہر جائے اور دام پوچھے تو بتا دیجیے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر ——"
"مگر کیا؟"
"مجھے شرم آتی ہے۔"
"واہ۔ محنت میں بھلا کیا شرم۔ کیا محنت کوئی عیب کی بات ہے؟"
"نہیں یہ بات تو نہیں مگر ——"

غرض بڑی ہچکچاہٹوں کے بعد مولانا بادل ناخواستہ نکٹائیاں اور بٹوے لے کر بازار گئے۔ فرخندہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اور بے تابی سے ان کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب وہ واپس آئے۔ ان کے چہرے سے ایسی پریشانی اور تکان ظاہر ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ کسی سخت آزمائش میں سے گزر کر آرہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ صرف ایک بٹوا چونی میں بیچ سکے۔ فرخندہ نے جب ان سے نکٹائیاں واپس لے کر گنیں تو دو درجن میں سے پانچ غائب تھیں۔ وہ ہزار ہزار قسمیں کھانے لگے کہ انہیں ان کا کچھ علم نہیں۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ اصل میں وہ تھیں ہی اتنی اور فرخندہ سے گننے میں غلطی ہو گئی تھی۔ بہر حال یہ ظاہر تھا کہ یا تو راستے میں ان سے کہیں گر پڑی تھیں اور یا دیکھنے دیکھنے میں یار لوگ اڑا لے گئے تھے۔

پورے دو ہفتے گزر گئے۔ محسن عدیل ابھی تک اس گاؤں میں نہیں جا سکا تھا جہاں غفار کا باپ رہتا تھا۔ اس نے فرخ بھابی سے وعدہ تو کر لیا تھا مگر ہر روز کچھ

ایسا کام نکل آتا کہ اس کا جانا معرضِ التوا میں پڑ جاتا۔ اس کے دوسرے دوستوں نے ریلوے اسٹیشن اور شہر کے گلی کوچوں کے بہتیرے چکر کاٹ لیے تھے مگر نہ تو انہیں غفار ہی کہیں نظر آیا تھا اور نہ مشین ہی کا کچھ سراغ مل سکا تھا۔

فرخندہ نے یہ زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا اور اپنی ظاہری حالت کو برقرار رکھنے کے لیے انتہائی جدوجہد کی۔ وہ اپنے دوستوں کو اپنی پریشانیوں میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ نہ تو اس نے کسی دوست سے کوئی فرمائش کی اور نہ اشارے کنائے ہی سے کچھ امداد چاہی۔ اس کے دوست اپنی خوشی سے شام کو کھانے کے لیے کچھ لے آتے تھے تو اپنے ہاں کی دال بھاجی کے ساتھ اسے بھی دسترخوان پر چُن دیتی۔ اور پھر ہنسی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھالیتی۔ محفل برخاست ہونے پر جب اس کے دوست اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تو وہ دیر تک بستر پر پڑی اپنی حالت پر غور کرتی رہتی۔ اس مصیبت میں اسے کسی دوست سے گلہ یا شکایت نہ تھی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ خود ان میں سے کسی کی حالت بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ اگر وہ دس روز کام کرتے تھے تو بیس روز بیکار پھرتے تھے۔ پھر جو مستقل طور پر کسی دھندے میں لگے تھے ان کی آمدنی بھی اس درجہ قلیل تھی کہ وہ اس میں بمشکل اپنا اور متعلقین کا پیٹ ہی بھر سکتے تھے، کسی دوسرے کی امداد تو کیا کر سکتے۔ انہی غموں فکروں میں پڑی رات رات بھر جاگا کرتی یہاں تک کہ مؤذن کی آواز سنائی دینے لگتی اور وہ جلدی سے اٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتی۔

اس نے اپنی کفایت شعاری اور سلیقہ مندی سے جو تھوڑی سی پونجی آڑے وقت کے لیے بچا رکھی تھی وہ تو بیکاری کے پہلے ہفتے ہی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ان برتنوں کی باری آئی جو بہت ضروری نہیں تھے۔

وہ چپکے چپکے مولانا کی معرفت انہیں بیچتی رہی۔ مولانا کو سخت تاکید تھی کہ کسی سے کہنا نہیں جب مہینہ ختم ہوا اور مکان دار کا آدمی کرایہ اور شین والا قسط اگاہنے آیا تو وہ مولانا کو ساتھ لے کر بازار گئی اور اپنا وہ ننھا منا طلائی بریط جسے وہ کبھی کبھی سیاہ ربن کے ساتھ گلے میں باندھا کرتی تھی سنار کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اور اس طرح کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر اس نے مکان کا کرایہ بھی ادا کر دیا اور شین کی قسط بھی دے دی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے، ایک شام ابھی فرخ بھابی کی محفل میں چار پانچ ہی آدمی آئے تھے کہ مولانا ایک اجنبی کو لیے ہوئے آ گئے۔ وہ دوپہر کے بعد سے نہ جانے کہاں غائب رہے تھے۔ دالان سے گزرتے ہوئے انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اپنے ساتھی سے کہا:

"بلا تکلف اندر تشریف لے چلیے میر صاحب! اپنا ہی گھر ہے" ان کے لہجے سے بڑی چونچالی ٹپک رہی تھی۔

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ فرخندہ نے جلدی سے سر پر دوپٹے کو درست کیا۔ وہ بار بار مولانا کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتی تھی مگر مولانا تھے کہ ملتفت ہی نہ ہوتے تھے۔

"آئیے آئیے۔ غریب خانہ میں تشریف لے آئیے —— اے آمدنت باعث آبادی ما ..... ٹھہریئے میں ذرا فرش جھاڑ دوں۔"

کھونٹی پر ایک میلا سا تولیا ٹنگا ہوا تھا، مولانا نے جلدی سے اتارا، فرش کے ایک کونے کو جھاڑا۔ چاندنی کی سلوٹیں نکالیں اور اجنبی کو اس جگہ بٹھا دیا۔ سب لوگ

اس دوران میں آپ ہی آپ ذرا ذرا پرے سرک گئے تھے۔ ہر شخص نقادانہ کنکھیوں سے نووارد کو دیکھ رہا تھا اور واقعی وہ شخص تھا بھی نقادوں ہی کے دیکھنے کی چیز۔ بلند و بالا قد، چوڑا سینہ، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، عمر تقریباً چالیس برس، گندمی رنگ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سرمے کے ڈورے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، ان کو بل دیا ہوا۔ سر سے پیر تک دیہاتی امارت اور بانکپن کا نمونہ، کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ اس پر سرخ بانات کی واسکٹ اور اس پر سیاہ شیروانی۔ شیروانی کے سینے سے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے جس کی وجہ سے نیچے کی واسکٹ اور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شیروانی کی جیب میں گھڑی جس کی طلائی زنجیر شیروانی کے کاج سے اٹکی ہوئی۔ زنجیر کے ساتھ ایک ننھا سا طلائی قطب نما آویزاں۔ ایک گھڑی کلائی پر بندھی ہوئی، اس کے سنہرے رنگ کی حفاظت کے لیے اس پر سفید سلولائڈ کا خول چڑھا ہوا۔ شیروانی کے بٹن چاندی کے بڑے بڑے چوکور جن پر نیلا نیلا چاند تارا بنا ہوا۔ ایک ریشمی رومال شیروانی کی بائیں آستین کے اندر ٹھنسا ہوا۔ داہنے ہاتھ کی چھنگلیا میں سونے کی انگوٹھی جس میں بڑا سا ہلکے آسمانی رنگ کا نگینہ جڑا ہوا۔ چوڑی دار پاجامہ۔ پاؤں میں سرخ ریشمی جرابیں۔ سر پر رامپوری وضع کی اودے رنگ کی مخملی ٹوپی۔

دو تین لمحے خاموشی رہی جس کے دوران میں مولانا کے سوا ہر شخص بے چینی محسوس کرتا رہا۔

"آپ ہیں،" بالآخر مولانا نے زبان کھولی "میرے خاص کرم فرما اور ہم وطن میر نوازش علی۔ ہمارے قصبے کے سب سے بڑے تعلقہ دار قبلہ میر حشمت علی کے بڑے صاحبزادے۔ مجھے بچپن سے آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہے . . . . اور میر صاحب

یہی ہیں ہماری فرخ بھابی - اور یہ ہیں ان کے وہ دوست جن کا حال میں راستے میں آپ سے عرض کر چکا ہوں "

تعارف کا یہ طریقہ فرخندہ کے دوستوں کو کچھ بے تکا معلوم ہوا۔ چنانچہ بعض نے منہ پھیر کر تو بعض نے ناک سکوڑ کر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔

ہمارے میر صاحب کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے" مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھا " ماشاءاللہ بچپن ہی سے ذہین تو ایسے تھے کہ سات برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا - دس برس کی عمر میں گلستاں اور بوستاں پڑھ لی ۔گیارہ برس کی عمر میں دیوانِ حافظ ختم کر لیا۔

" بارہ برس کی عمر میں بھئی " میر صاحب نے دبی آواز میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

" چلیے بارہ برس ہی میں سہی " مولانا نے خندہ پیشانی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا "لیکن بارہ برس کا سن بھی کوئی سن ہے - آج کل کے نئی روشنی کے زمانے کے کسی پڑھے لکھے سے کہیے تو حافظ کا ایک مصرع بھی صحیح پڑھ دے - بس بغلیں جھانکنے لگے گا وہیں۔ البتہ انگریزی ، انہوں نے نہیں پڑھی ۔ وہ یوں کہ خاندانی وضع داری کے خلاف تھا اور پھر ضرورت بھی کیا تھی - خدانخواستہ کسی انگریز کی نوکری تھوڑی کرنی تھی - اللہ رکھے اپنی لاکھوں کی جاگیر ہے - ہم جیسے بیسیوں جوتیاں چٹخاتے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں . . . . . "

" ارے بھئی چھوڑو بھی ان باتوں کو " میر صاحب بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بولے - دراصل وہ حاضرین کے چہروں سے بھانپ گئے تھے کہ وہ اس ذکر سے اکتا گئے ہیں - انہوں نے شیروانی کی جیب سے پانوں کی مرادآبادی منقش ڈبیا

نکالی اور اسے کھولتے ہوئے محسن عدیل کی طرف بڑھایا۔ جو ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔
"شوق فرمائیے۔"
"تسلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"
"آپ لیجیے۔" میر صاحب نے ڈبیا دیپ کمار کو پیش کی۔
"معاف کیجیے گا۔ پان تو میں بھی نہیں کھایا کرتا۔"
"ابے کھا بھی لو میرے یار۔" مولانا بولے۔ "ایسا ہی ہے تو تھوک دینا۔"
مگر دیپ کمار نے ڈبیا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ دو آدمیوں کے انکار کر دینے پر میر صاحب کو پھر کسی کو پان پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔
"لائیے مجھے دیجیے۔" فرخندہ کو میر صاحب پر رحم آ گیا۔ اور وہ بولی۔ "اگرچہ یہ نہایت نازیبا بات ہوگی۔ کیونکہ پان پیش کرنے کا فرض تو میرا تھا۔" اور ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے میر صاحب سے ڈبیا لے لی۔ میر صاحب نے خوش خوش شیروانی کی دوسری جیب سے چھالیا کا بٹوا، جو کمخواب کا بنا ہوا تھا، نکالا اور بڑے تکلف سے پیش کیا۔
"میر صاحب یہ بٹوا تو بہت نفیس ہے۔" فرخندہ نے بٹوے کو ایک ماہر کی طرح پرکھتے ہوئے کہا۔
"آپ کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"
"تسلیم۔" فرخ بھابی نے مسکرا کر کہا۔
مولانا کی باچھیں کھل گئیں۔
"فرخ بھابی خود بہت اچھے بٹوے بنانا جانتی ہیں۔" وہ میر صاحب سے بولے "کپڑا آپ لا دیجیے، سلوا ہم دیں گے۔"

بٹناگر دیر سے ضبط کیے بیٹھا تھا مگر اب اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اچانک بڑے زور سے جمائی لی اور میر صاحب کو اس انداز سے مخاطب کرتے ہوئے گویا برسوں کی شناسائی ہے، کہنے لگا:

"کہیے میر صاحب! دلی کیسے آنا ہوا؟ تفریح یا کوئی اور مقصد تھا؟"

قبل اس کے کہ میر صاحب جواب دیتے مولانا فوراً بول اٹھے:

"اجی تفریح کی ان کو اپنے وطن میں کیا کمی ہے۔ یہاں تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"آپ کو یہ مل کیسے گئے؟" بٹناگر نے پوچھا۔

"یہ بھی حسن اتفاق تھا" مولانا بولے "میں گھنٹہ گھر سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک بزاز کی دکان پر پڑی۔ دیکھا کہ زربفت کے تھانوں کے ڈھیر سامنے لگے ہیں اور حضرت ہیں کہ سب کو ناپسند کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھا تو پہچانا تھوڑا ہی۔"

"بھئی مولانا صاحب!" میر صاحب قطع کلام کر کے بولے "میں پھر کہتا ہوں معاف کرنا، میں پہلے واقعی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔"

"خیر وہ پہلے نہ سہی، بعد میں سہی پہچان تو لیا نا۔ بس پھر میں اصرار کر کے انہیں ساتھ ہی لیتا آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی جس میں اس بے کیف بات چیت کے بجائے سب کو ایک طرح کا سکون نصیب ہوا۔ محسن عدیل کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ان میر صاحب کا آنا اور سب کے درمیان یوں بے تکلف بیٹھنا اور فرخ بھابی سے باتیں کرنا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے مولانا پر بھی بے حد

غصہ آرہا تھا جس نے بغیر بتائے، بغیر صاحب خانہ سے اجازت لیے، ایک اجنبی کو ان سب کے سر پر لا مسلط کیا تھا۔

"کیوں تعلقہ دار صاحب" عدیل نے استہزا آمیز سنجیدگی سے میر صاحب کو مخاطب کیا: "آپ کے ہاں تو سب خیریت ہے نا؟"

"کیا مطلب؟" میر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گڑبڑ تو نہیں کچھ؟"

"معاف کیجیے گا، میں اب بھی آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"اجی وہ نئی تحریک چلی ہے نا آج کل کسانوں میں"

"کیسی تحریک؟ واللہ مجھے تو اس کا مطلق علم نہیں۔"

"اجی یہی کسان کہتے ہیں نا زمین میں ہل ہم جوتتے ہیں، کھیتی کسانی ہم کرتے ہیں، جاڑے گرمی کی سب تکلیفیں ہم سہتے ہیں مگر جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے تو زمیندار سارے اناج کا دعویٰ دار بن جاتا ہے اور ہمارے لیے اتنا بھی نہیں چھوڑتا کہ ہمارے بیوی بچے دو وقت اپنا پیٹ بھر سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ زمیندار زمین کا مالک ہے مگر وہ اتنی سی بات کا ہم سے بدرجہا زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا حصہ ملنا چاہیے۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ مختلف صوبوں میں پھیلتی جا رہی ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ سارے ملک کے کسان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بغاوت کر دیں۔"

"الحمد للہ" میر صاحب نے کہا: "میرا علاقہ اس قسم کی لغویات سے پاک ہے اور بفضلہٖ میرے ہاں کے کسان سب کے سب خوش اور میرے وفادار ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ خوش ہیں۔"

"بس یہی خوش؟"

"آخر اس کا کوئی ثبوت بھی؟"

"ثبوت؟ یہی کیا کم ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی نے آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔"

"ممکن ہے وہ آپ کے پاس آتے ہوئے ڈرتے ہوں۔ یا ممکن ہے کہ وہ آپ کے سنگ دلانہ نظام سے اس قدر مایوس ہو چکے ہوں کہ وہ اس سے کسی انصاف یا رحم و کرم کی توقع ہی نہ رکھتے ہوں۔"

"اجی چھوڑیے بھی" مولانا جنہیں اب صبر کی تاب نہ رہی تھی اچانک بیچ میں بول اٹھے: "کیا قصہ لے بیٹھے، ہم تو میر صاحب کو لائے تھے کہ کچھ شعر و شاعری کی باتیں ہوں گی، کچھ گل و بلبل کے قصے دہرائے جائیں گے، کچھ میر صاحب کا دل بہلے گا، کچھ میر صاحب آپ کا دل بہلائیں گے۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے پُر لطف صحبت رہے گی۔ مگر یہاں خشک سیاسیات کی بحث چھڑ گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہاں شکیبی صاحب کوئی ہلکا پھلکا گیت نہ ہو جائے۔"

"مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھیے۔" شکیبی نے جواب دیا: "صبح سے میرے سر میں درد ہے۔"

مولانا نے دیکھا کہ یہ تیر کارگر نہیں ہوا تو وہ فرخندہ کی طرف متوجہ ہوئے:

"فرخ بھابی! آج کچھ کھلاؤ گی نہیں۔ بھوکا ہی مارو گی؟"

اس غیر متوقع فرمائش پر فرخ بھابی اچانک جھینپ کر رہ گئی۔ مولانا نے آج شام جو رویہ اختیار کیا تھا اس نے سب کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ اگر ان کا دماغ چل نہیں گیا تھا تو وہ آج ضرور کوئی نشہ کر کے آئے تھے جس نے ایک ہی دم

ان کی سوئی ہوئی نامعلوم قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فرخندہ کے ہاں ان کی حیثیت اگر نوکر کی نہیں تو ایک ایسے غریب اور لاچار رشتہ دار کی ضرور تھی جو اپنے نسبتاً خوش حال عزیزوں کے ٹکڑوں پر پڑا ہو اور نوکر سے زیادہ کام کرتا اور اس سے بدتر حال میں رہتا ہو۔ یا تو وہ عام تضحیک کا شکار ہو کر ہر وقت دبے دبے اور چپ چپ رہنا اور کسی نے کوئی کام کرنے کو کہا تو جل کڑھ کر کرنا اور یا آج یہ حالت تھی کہ وہ خود صاحبِ خانہ بنے ہر ایک پر حکم چلا رہے تھے۔ پھر دنیا بھر کی زندہ دلی ان میں بھر گئی تھی۔ فرخندہ، جو طبعاً حلیم تھی ان کی کایا پلٹ پر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ مگر جب انہوں نے کھانے کی فرمائش کی تو وہ بلبلا ہی تو اٹھی۔ کم بخت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان دنوں کس قدر تنگی ترشی میں گزر رہی ہے اس کے باوجود یہ ایک غیر آدمی کے سامنے رسوا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ادھر فرخندہ کے دوست بار بار تیز تیز نظروں سے مولانا کو گھور رہے تھے — ان نظروں سے جو عنقریب میں نہایت ناخوشگوار نتائج کی طرف کھلے بندوں اشارے کر رہی تھیں۔ مگر مولانا کو آج کسی کا ڈر نہ تھا۔

"ارے بھئی فرخ بھابی!" وہ اپنی چونچالی کو بدستور قائم رکھے ہوئے کہہ رہے تھے "تم تو سوچ میں پڑ گئیں، جو کچھ دال دلیا موجود ہے لے آئیے۔ میر صاحب سے کیا پردہ۔ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔ . . . . ہاں بھئی اگر صاحب کچھ ریزگاری ہو تو نکالیے، کباب و باب کے لیے۔"

بھٹناگر کے چہرے کا رنگ اچانک متغیر ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب تک گیا اور وہیں رہ گیا۔

اس پر میر صاحب نے کھنکھارا اور حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی ملائمت

نے کہا :

"حضرات میری گستاخی کو معاف فرمائیے گا۔ مجھے اس محفل کی بے تکلفی کا پورا پورا حال مولانا صاحب سے معلوم ہو چکا ہے اور اسی لیے مجھے جرأت ہوئی ہے کہ دسترخوان میں کچھ میرا بھی حصہ ہو۔ یہ حقیر رقم اس خاکسار کی طرف سے قبول کیجیے۔"

قبل اس کے کہ فرخ بھائی یا محفل کا کوئی رکن احتجاج کرنے پاتا انہوں نے جھٹ بٹوے میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال، فرش پر ڈال دیا۔

لمحہ بھر کے لیے ایسا معلوم ہوا جیسے ذلت، غصے، نفرت اور بیزاری کے ملے جلے جذبات کا وہ طوفان جو آدھ گھنٹے سے دلوں میں بڑھتا ہی جاتا تھا یک لخت اپنے بند توڑ کر پھوٹ پڑے گا مگر میر صاحب کے چہرے سے ایسا خلوص اور نیک نیتی برس رہی تھی کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا اور وہ سب دم بخود رہ گئے۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد میر صاحب نے مولانا سے کہا :

"حضرت جائیے، آپ ہی ہمت کیجیے۔"

"بسر و چشم۔" یہ کہہ کر مولانا نے فرش سے نوٹ اٹھا لیا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر وہ سیڑھیوں سے اتر گئے۔

وہ وقت جو ان کے جانے کے بعد محفل میں گزرا انتہا درجہ کا تکلیف دہ تھا۔ ہر چند بظاہر خاموشی رہی مگر اندر ہی اندر ہر شخص بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ فرخندہ میر صاحب سے معذرت کر کے عشار کی نماز کے لیے اپنی کوٹھڑی میں اٹھ آئی مجسن عدیل جو گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا اس نے پہلو بدل کر اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دیپ کمار انگریزی اخبار کا ضمیمہ پڑھنے لگا تھا حالانکہ لالٹین کی روشنی اس کے لیے ناکافی تھی اور اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا جیسے وہ بار بار

انگلیوں سے پونچھ لیتا تھا۔ بھٹناگر نے کوٹ کی جیب سے تاش نکال کر فرش پر بازی لگانی شروع کر دی تھی۔ ادھر میر صاحب نے بھی کسی کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ اس عرصے میں بڑی دل جمعی کے ساتھ پانوں کی ڈبیا سے پان نکال نکال کر کھاتے رہے۔ جب فرخندہ نماز سے فارغ ہو کر آئی تو انہوں نے ایک پان اسے بھی پیش کیا جسے اس نے تسلیم کر کے لے لیا۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد مولانا کی آواز سیڑھیوں میں سنائی دی۔ وہ کسی کو سنبھل سنبھل کر آنے کی تاکید کر رہے تھے۔ یہ ہوٹل کا ایک بیرا تھا جو بڑا سا ایک خوان اپنے کندھے پر اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"اِدھر لے آؤ بھئی اس کمرے میں۔ شاباش" مولانا پُر اعتماد لہجہ میں بیرے سے کہہ رہے تھے "تمہیں خوش کر دیں گے۔"

کمرے میں ابھی دسترخوان بچھایا ہی جا رہا تھا کہ دالان میں سے ٹرام کے کنڈکٹر قاسم کی آواز سنائی دی۔

"آہا ہا ہو ہو ہو! فرخ بھابی! آج کیا بات ہے، بڑی بڑی ضیافتیں اُڑ رہی ہیں یہاں۔ واللہ پلاؤ کی خوشبو نے بے چین کر دیا۔"

مگر جیسے ہی اس نے کوٹھری کے اندر قدم رکھا اور ایک اجنبی کی شکل دیکھی، اس کی ساری خوشی اور زندہ دلی کافور ہو گئی۔ اور وہ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

"آؤ بھئی قاسم" مولانا نے بڑے سرپرستانہ لہجہ میں قاسم سے کہا۔ "خوب وقت پر آئے۔ ان سے ملو، یہ میرے خاص کرم فرما میر نوازش علی ہیں۔"

قاسم کو اس غصے اور ملال کا کچھ علم نہ تھا جو اس ناخواندہ مہمان کے خلاف اس کے دوستوں کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ضرورت سے

زیادہ گرم جوشی کے ساتھ میر صاحب سے مصافحہ کیا۔

اَب دستر خوان بچھ چکا تھا۔ محسن عدیل اور دیپ کمار تو کھانا کھا کر آنے کا عذر کرکے الگ ہو گئے۔ مگر مولانا فرخ بھابی، میر صاحب اور قاسم کی متفقہ کوششیں بھنا گر اور شکیبی کو دستر خوان پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئیں اس عرصے میں میر صاحب ان لوگوں سے کسی قدر اور بے تکلف ہو گئے تھے۔ کھانا کھانے کے دوران میں انہوں نے سعدی کے دو ایک شعر بھی پڑھے جو تھے تو فرسودہ مگر چونکہ طعام ہی کے متعلق تھے اس لیے پسند کر لیے گئے۔

کھانے کے بعد مولانا نے پھر شکیبی سے شعر کی فرمائش شروع کر دی۔ اب کے میر صاحب نے بھی اصرار کیا اور فرخ بھابی نے بھی ان کا ساتھ دیا کہ ہاں ہاں بھئی ہو جائے وہی نظم۔ چنانچہ شکیبی کو "سرخ برکھا" ایک مرتبہ پھر سناتے ہی بنی۔

رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہو گا کہ یہ محفل برخاست ہوئی۔ میر صاحب نے رخصت ہوتے وقت بڑی گرمجوشی سے فرخ بھابی اور اس کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ ان سے اجازت لے کر مولانا کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

اگلے روز صبح کو کوئی نو ساڑھے نو بجے مولانا واپس آتے، مگر اس شان سے کہ آگے آگے یہ دونوں بغلوں میں دو مرغ دبائے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ایک جھلّی والا تھا جس کا ٹوکرا قسم قسم کے اجناس۔ ترکاریوں اور پھل پھلاری سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

"حسنت خیر باشد" فرخندہ نے مولانا اور جھلّی والے کو تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سب کہاں سے اٹھا لائے۔"

"ذرا دم تو لینے دو فرخ بھابی! ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر مولانا مسکرائے۔

پھردم سے بغیر خود ہی کہنا شروع کیا " میر صاحب نے تم کو سلام کہا ہے ۔ وہ تمہارے حسنِ سلوک اور تمہاری طبیعت داری کی بے حد تعریف کرتے تھے ۔ پھر کہنے لگے، رات ہوٹل کا کھانا سخت بدمزہ تھا ۔ میں چاہتا ہوں کہ آج محفل کے جملہ اراکین کی دعوت کروں مگر چونکہ پردیس کا معاملہ ہے اور میں ہوٹل میں مقیم ہوں جہاں دعوت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا اس لیے آپ کو یہ زحمت دی گئی ہے، میں اس کے لیے سخت شرمندہ اور معافی کا خواستگار ہوں ۔"

شام سے پہلے ہی سب کھانے پک کر تیار ہو گئے ۔ ادھر میر صاحب بھی وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے ۔ اس وقت گھر میں فرخندہ اور مولانا کے سوا جو چولھے کے پاس بیٹھے تھے اور کوئی نہ تھا ۔ میر صاحب کل کی نسبت آج کافی سادہ لباس پہن کر آئے تھے ۔

" معاف کیجیے گا ۔" وہ کہنے لگے ۔" میں ابھی سے حاضر ہو گیا ہوں تاکہ انتظام میں میں بھی آپ لوگوں کا ہاتھ بٹاؤں ۔"

یہ کہتے ہی انہوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی شیروانی اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی اور صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے اپنے کو بڑی معصومیت کے ساتھ فرخ بھابی کے سامنے پیش کر دیا ۔

فرخندہ نے میر صاحب پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی ۔ اس لباس میں وہ بڑے وجیہہ اور گھریلو معلوم ہو رہے تھے ۔ پھر اس نے لحہ بھر کے لیے تامل کیا، گویا دل ہی دل میں سوچ رہی ہے کہ ان سے کیا خدمت لوں ۔ دھیرے دھیرے ایک دلآویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلتی گئی ۔

" آپ کی ہمدردی کا شکریہ ۔" آخر وہ بولی ۔" اب آپ کو تکلیف کرنے کی

ضرورت نہیں ۔ میں نے دن میں ایک کھانا پکانے والی منگوالی تھی ۔ قریب قریب سب کھانے پک چکے ہیں ۔ آپ چل کر آرام سے اندر بیٹھیے ۔"

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں کو اس دعوت کا حال معلوم ہوا تو انہیں بہت تعجب ہوا ۔ بعض نے تو اس بات کو سخت ناپسند کیا ۔ مگر زیادہ تر نے اسے خوش طبعی میں اڑانا چاہا کہ اچھا کاٹھ کا الّو پھنسا ہے ۔ بہر حال اس دعوت میں دیپ کمار کے سوا جو ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے محفل ہی سے اٹھ گیا تھا اور سب لوگ شریک ہوئے ۔ کھانا بے حد لذیذ تھا ۔ فرخ بھابی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پکایا تھا چنانچہ ہر شخص نے پیٹ بھر بھر کر کھایا ۔ میر صاحب بار بار کھانے کی تعریفیں کرتے تھے ۔ اب وہ سب لوگوں سے کافی گھل مل گئے تھے اور ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے ۔ اہلِ محفل کو بھی اب ان سے وہ کل والا عناد نہیں رہا تھا ۔ یا کم سے کم وہ اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے ۔ محسن عدیل نے البتہ دو ایک دفعہ اشاروں کنایوں میں ان پر چوٹ کی ۔ مگر وہ ایسی گہری تھی کہ ڈاکٹر ہمدانی اور ایک آدھ اور کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھ سکا ۔ ڈاکٹر ہمدانی سے اور میر صاحب سے آج پہلی مرتبہ شناسائی ہوئی تھی اور میر صاحب ڈاکٹر ہمدانی کی بذلہ سنجی سے بہت محظوظ ہوتے تھے ۔

اس رات یہ محفل کوئی گیارہ بجے تک جاری رہی ۔

اس سے اگلے روز میر صاحب سہ پہر ہی کو فرخندہ کے ہاں آ گئے ۔ آج پہلے دن کی طرح وہ پھر بن ٹھن کر آئے تھے ۔ آتے ہی انہوں نے بغیر کسی تمہید کے فرخندہ سے کہنا شروع کیا :

"کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ ۔ فرخندہ خانم ! آپ بھی کہیں گی کہ یہ روز روز کی مصیبت اچھی گلے پڑی ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک امر میں آپ کی امداد کی اشد

ضرورت ہے۔۔۔ بات یہ ہے کہ دو ایک ماہ میں میری چھوٹی ہمشیرہ کا عقد ہونے والا ہے۔ میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں یہاں آنے لگا تو قبلہ والد محترم نے فرمایا، جاتو رہے ہی ہو، بچی کے جہیز کے لیے پارچات بھی خریدتے لانا سنا ہے دلی میں پارچات کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ میں نے حکم عدولی کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں جاہل محض ہوں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا کہ آپ میرے ساتھ چل کر مجھے کپڑا دلوا دیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ آپ ماشاء اللہ اس کام میں بہت ہوشیار ہیں اور پھر عورتوں کی پسند کچھ عورتیں ہی بہتر سمجھتی ہیں۔"

میر صاحب نے یہ درخواست کچھ ایسی سادگی کے ساتھ کی تھی کہ نیک دل اور خدمت گزار فرخ بھابی کو انکار کرتے نہ بنی۔ چنانچہ تھوڑے سے تامل کے بعد وہ مولانا کو ہمراہ لے کر میر صاحب کے ساتھ ہو لی۔ تھوڑی دور پر بازار میں میر صاحب کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ تینوں اس میں سوار ہو، چاندنی چوک روانہ ہو گئے۔

شام کا اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا جب یہ لوگ گھر لوٹے۔ واپسی پر میر صاحب ان کے ہمراہ نہیں تھے۔ وہ اپنے ہوٹل پر اتر گئے تھے اور ٹیکسی والے سے کہہ دیا تھا کہ ان کو ان کے گھر پہنچا آئے۔

اس رات جب محفل جمی تو محسن عدیل نے آتے ہی فرخ بھابی اور مولانا سے پوچھنا شروع کیا:

"یہ آپ لوگ آج شام کو کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں دو دفعہ آیا مگر گھر میں تالا پڑا دیکھ کر چلا گیا۔"

اس پر فرخندہ نے میر صاحب کا حال سنایا کہ کس غرض سے وہ آئے اور پھر کس طرح ان کے ساتھ جا کر اس نے ڈیڑھ ہزار روپے کا کپڑا ان کی ہمشیرہ کے جہیز کے لیے

خریدا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ جب سب کپڑے وغیرہ خرید چکے تو میر صاحب نے زبردستی ایک
بنارسی ساری سو روپے کی اسے بھی خرید دی۔ وہ بہتیرا انہیں نہیں کرتی رہی مگر میر صاحب
نے ایک نہ سنی مولانا کو بھی ایک گرم اونی سویٹر لے دیا۔

پھر فرخندہ اپنی کوٹھری میں گئی اور وہ ساری لاکر سب کو دکھائی۔

محسن عدیل کچھ دیر خاموشی سے ساری کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی
کے ساتھ کہا:

"فرخ بھابی! اس میں شک نہیں کہ یہ ساری بہت خوبصورت ہے مگر میں تمہیں
مشورہ دوں گا کہ جس قدر بھی جلدی ہو سکے اسے لوٹا دو۔"

یہ سن کر فرخندہ کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس نے گردن جھکالی۔
مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تم خود ہی سوچو" محسن عدیل نے پھر کہنا شروع کیا "ایک شخص جس سے ہماری
جان نہ پہچان، ان دو دنوں سے پہلے ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا ——"

"لیکن میں تو جانتا ہوں" مولانا بیچ میں بول اٹھے۔

"تم چپ رہو جی ...... ایک شخص جو پہلی ہی ملاقات میں دوسروں پر اس
طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے..."

"لاحول ولاقوۃ" مولانا سے پھر چپ نہ رہا گیا "عدیل میاں! آپ بھی
کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خدانخواستہ انہوں نے فرخ بھابی کو یہ ساری کسی بُری نیت سے
تھوڑا ہی لے کے دی ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی فیاض واقع ہوئے ہیں۔"

"ہمیں ان کی فیاضی کی کوئی ضرورت نہیں" بھٹناگر نے تاؤ کھا کر کہا "آخر
کیا مطلب ہے اس کا؟"

محسن عدیل پھر فرخندہ کی طرف متوجہ ہوا:
"فرخ بھابی! میں نے جو کچھ کہا آپ نے سن لیا! اب کے وہ آئیں تو یہ ساری انہیں لوٹا دینا۔ کہنا اس میں برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ آخر کیا حق ہے ان کو اس قسم کا تحفہ دینے کا۔ اور اگر ہو سکے تو کسی طرح یہ بھی جتا دینا کہ ہم سب لوگ ان کے یہاں آنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اگر تم نہ کہو گی تو پھر مجبوراً یہ ناگوار فرض ہمیں ادا کرنا ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے نتائج کیا ہوں۔ . . . سمجھ گئیں؟"
"اچھی بات ہے۔" فرخندہ نے ہلکے سے کہا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور اس رات پھر محفل میں نہ آئی۔
اگلے روز محسن عدیل، بھٹناگر اور دیپ کمار سہ پہر ہی سے فرخندہ کے ہاں آدھمکے وہ بڑی دیر تک بیٹھے بیٹھے میر صاحب کا انتظار کرتے رہے۔ مگر میر صاحب نہ آئے۔ دوسرے روز بھی یہ لوگ سویرے ہی سے آگئے۔ مگر میر صاحب اس دن بھی نہ آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یا تو مقدمے کے سلسلے میں انہیں فرصت ہی نہیں ملی کہ ادھر کا رخ کرتے اور یا پھر وہ شہر ہی سے چلے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا مگر انہوں نے فرخندہ کے ہاں اپنی شکل نہ دکھائی۔
اس قضیئے کو بغیر کسی بدمزگی کے یوں آپ ہی آپ ختم ہوتا دیکھ کر فرخندہ کے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان میں پھر وہ پہلی سی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ یہ سچ ہے کہ شروع کے دو تین دنوں میں فرخ بھابی زیادہ تر اپنی کوٹھری ہی میں رہی مگر پھر آپ ہی آپ ملاپ ہو گیا اور ان کی محفل میں پھر پہلی سی چہل پہل نظر آنے لگی
مگر ان کے دل کا یہ سکون فقط چند روزہ تھا کیونکہ اس کے بعد جوں جوں دن گزرنے لگے فرخ بھابی کے مزاج اور کردار میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ

یا تو وہ سنگھار اور زیب و زینت سے کوسوں کوس بھاگتی تھی یا اب وہ اس کا خاص اہتمام کرنے لگی تھی۔ شام کو محفل میں بیٹھتی تو اس کے لباس اور چہرے سے قسم قسم کے عطروں، لونڈروں اور غازوں کی خوشبوئیں بھبوٹا کرتیں۔ گھر کا کام کاج اب وہ خود نہیں کرتی تھی بلکہ ایک مہری کو نوکر رکھ لیا تھا جو دونوں وقت آکر کھانا پکا جاتی اور جھاڑو بہارو کر جایا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی حرکات اور نگاہوں سے ایک سستی اور آلکس سی بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس زمانے میں کسی نے اسے سیتے پروتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ایک چیز ایسی تھی جس کی باقاعدگی میں اس نے ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا تھا۔ اور وہ تھی نماز۔ وہ اب بھی اس فریضہ کو پابندیٔ وقت کے ساتھ ادا کرتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا مذہبی جوش کچھ پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی جسے فرخ بھابی کے دوستوں نے محسوس کیا یہ تھی کہ کہاں تو پہلے وہ شاذ ہی کبھی گھر سے باہر نکلتی تھی اور کہاں اب وہ ہفتے میں دو دو تین تین دن چپکے سے دوپہر کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے غائب ہو جایا کرتی۔ یہ لوگ مولانا سے پوچھتے تو وہ بڑے الھڑپن سے جواب دیتے:

"میں کیا جانوں! مجھ سے کہہ کے تھوڑا ہی جاتی ہیں!"

فرخ بھابی سے پوچھا جاتا کہ کہاں گئی تھیں۔ تو لمحہ بھر کو اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل کر جواب دیتی:

"کہیں بھی نہیں یہیں قریب ہی میری ایک سہیلی بن گئی ہے۔ مجھ سے سلائی کا کام سیکھتی ہے۔ بچاری بڑی اخلاص والی بیوی ہیں۔ میری چوری کا حال سنا تو کہنے لگیں، میرے ہاں ایک مشین فالتو پڑی ہے، تم چاہو تو لے جا سکتی ہو مگر مجھے شرم آگئی۔ . . ." اور یہ لوگ سن کر خاموش ہو جاتے۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے، ایک دوپہر کو وہ ایسی گھر سے غائب ہوئی کہ رات کے آٹھ بج گئے مگر اس نے صورت نہ دکھائی۔ آج تک کسی شام وہ محفل سے غیر حاضر نہ رہی تھی۔ اس پر جاڑے کا موسم، رات کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کی تشویش بھی۔ جب نو بج گئے اور وہ نہ آئی تو ان لوگوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ مولانا سے دوبارہ پوچھا گیا۔ ان کے پاس ایک ہی جواب تھا: "میں کیا جانوں!" بھٹناگر، قاسم اور دیپ کمار نے ارادہ کیا کہ بازار میں جا کر اسے تلاش کریں۔ مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جائیں تو کہاں جائیں اور پوچھیں تو کس سے پوچھیں۔ آخر جب دس بج چکے تو سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ تیزی سے دالان سے گزرتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں پہنچ گئی۔

محسن عدیل، بھٹناگر اور دوسرے سب لوگ اس کی اس حرکت پر تلملا ہی تو گئے۔ یہاں اس کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کے عوض میں یہ بے اعتنائی کہ ان کو یہ جاننے تک کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ آخر وہ اتنا عرصہ کہاں رہی، خیر تو تھی۔ اس پر کیا بیتی۔

"میں جا کے پوچھتا ہوں۔" اچانک قاسم بولا۔

"نہیں، مت جاؤ۔" محسن عدیل نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "انہیں غرض ہوگی تو خود آئیں گی۔"

مگر اس رات فرخ بھابی کو غرض نہ ہوئی اور وہ نہ آئی۔ البتہ اس نے آواز دے کر مولانا کو بلایا:

"مولانا صاحب! وہ ذرا پانی کا گھڑا تو اٹھا کے اندر رکھ دیجیے۔"

اس سے اگلے روز فرخ بھابی گھر سے کہیں باہر نہ گئی۔ بلکہ کسی قسم کا سنگھار بھی

نہ کیا۔ شام کو جب اس کے دوست آئے تو وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر ملی مگر پچھلی رات کے واقعہ کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ ادھر لوگوں نے بھی مصلحتاً اس کا ذکر نہ کیا۔ مگر دل میں سب کے غبار بھرا تھا۔ اس دن اس نے اپنے دوستوں کے لیے دو تین قسم کے کھانے خود پکائے تھے۔ چنانچہ سب کو مجبور کر کے ان کی بھوک سے زیادہ انہیں کھلایا۔ اس رات وہ ذرا دیر کو بھی ان کے پاس سے نہ اٹھی اور جب اس کے دوستوں میں سے کوئی رخصت ہونے لگتا تو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی۔ غرض اسی طرح یہ محفل بڑی رات گئے تک جمی رہی۔

اس کے بعد جو چار دن گزرے ان میں بھی اس نے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ بلکہ بہت سادہ لباس پہنے وہ اپنے دوستوں ہی کی تواضع اور دل جوئی میں لگی رہی۔ اس پر اس کے دوستوں کے دلوں میں جو ملال تھا وہ بڑی حد تک دور ہو گیا۔ انہوں نے خیال کیا، گو یہ زبان سے کچھ نہ کہے مگر اس میں شک نہیں کہ دل ہی دل میں یہ اپنی حرکتوں پر سخت نادم ہے اور یہ ساری نوازشیں اس ندامت کو مٹانے ہی کے لیے تو ہیں، اور یہ کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہیے۔ . . . غرض اس کے دوستوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو گئے اور انہیں پھر سے یقین ہو چلا کہ وہ اپنی پچھلی حرکتوں سے تائب ہو کر پھر ان کی وفا شعار اور اطاعت گزار فرخ بھابی بن گئی ہے۔

مگر پانچویں روز سہ پہر کو وہ پہلے سے بھی زیادہ بناؤ سنگھار کر کے کسی کو بتائے بغیر پھر غائب ہو گئی۔

جب وہ نو بجے تک نہ آئی تو محسن عدیل نے ایک لمبی انگڑائی لیتے ہوئے بھٹناگر سے کہا: "بھئی بھٹناگر! اب تو یہ حالت برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔"

"اس میں کلام ہی کیا ہے۔" بھٹناگر نے جواب دیا۔

"مجھے کئی دنوں سے ایک خیال آرہا ہے۔" قاسم نے کہا۔
"وہ کیا؟" محسن عدیل نے پوچھا۔
"وہ یہ کہ جس سے کوئی ملنا چاہے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ گھر نہ سہی باہر سہی۔"
"تمہارا اشارہ میر صاحب کی طرف ہے؟" بھٹناگر نے پوچھا۔
"میر صاحب ہو یا کوئی اور ہو۔" قاسم نے کہا۔
لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد عدیل نے جیسے ایک گہری سوچ میں سے اُبھرتے ہوئے قاسم سے کہا:
"شاید تمہارا خیال صحیح ہے۔"
"پھر آخر اس کا کیا علاج کیا جائے؟" بھٹناگر نے پوچھا۔
"علاج اس کا صرف ایک ہی ہے۔" عدیل نے کہا۔ "وہ یہ کہ ہم اس سے قطع تعلق کرلیں اور یہاں کا آنا جانا بالکل چھوڑ دیں۔"
مگر فرخ بھابی اور اس کی محفل کے بغیر ان لوگوں کو اپنی زندگیاں اس قدر سونی سونی دکھائی دیں کہ ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔
جب شہر کے گھڑیال نے دس بجائے تو باہر بڑے زور کا جھکڑ چل رہا تھا۔ یکایک محسن عدیل چونک اٹھا۔
"مولانا! مولانا!" اس نے مولانا کو ہلایا جو پاس ہی فرش پر کملی تانے پڑے تھے۔
"کیا ہے بھئی؟" مولانا نے منہ سے کملی ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
"مولانا صاحب! آپ کو زحمت تو ہو گی مگر ایک بہت ضروری کام ہے۔"
"سونے نہیں دو گے یار۔ کیا کام ہے؟" وہ بڑبڑائے۔
"میں پوچھتا ہوں، گھر میں کچھ لکڑیاں ہیں؟"

"ہاں ہوں گی دو چار۔"

"تو ذرا مہربانی کر کے چولھے میں آگ تو جلا دیجئے۔"

"ارے بھئی اس وقت آگ کا کیا کام؟"

"آپ جلائیے تو، کام بھی بتاؤں گا۔ اٹھیے اٹھیے، ہمت کیجئے۔"

فرخ بھابی کی عدم موجودگی میں مولانا محسن عدیل سے دب جایا کرتے تھے۔ وہ نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا کہتے ہوئے اٹھے۔ لالٹین کے پاس طاق میں دیا سلائی کی ڈبیا رکھی تھی۔ اسے اٹھایا اور کوٹھڑی سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تڑ تڑ کی آواز آنے لگی۔ ساتھ ہی مولانا نے للکار کر کہا:

"لو جل گئی آگ، اب کیا ہو گا؟"

"اب ایک دیگچے میں پانی بھر کر اس پر رکھ دیجئے۔"

مولانا کا صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا:

"آخر بتاؤ تو پانی کیا ہو گا؟"

اس کا جواب سننے کے لیے مولانا ہی نہیں بلکہ محسن عدیل کے سارے ساتھی بھی انہی جیسا اشتیاق رکھتے تھے۔ چنانچہ بھنا گر جو اکیلا ہی فرش پر بازی لگا رہا تھا اس کے ہاتھ میں تاش کا پتا پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ دیپ کمار سراغ رسانی کا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا تھا، اس کی نظریں پڑھتے پڑھتے آخری لفظ پر جم کر رہ گئیں اور اس کے کان محسن عدیل کی آواز پر لگ گئے۔ قاسم اور شکیبی پاس ہی پاس بیٹھے تھے نہ جانے کن تصورات میں غرق تھے۔ دونوں نے چونک کر پُر معنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں عدیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"بھئی تم نہیں سمجھتے۔" آخر محسن عدیل نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے

ایک سرگوشی سی بن گئی تھی "بات یہ ہے، اس دن وہ آئی تھیں نارات کو۔ اور پھر غسل کیا تھا نا ٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا، بیکار بیٹھے ہیں، اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں پانی ہی گرم کر دیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا، اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء

ناک کاٹنے والے

تین شخص چغے پہنے، سر پر آڑی ترچھی پگڑیاں باندھے، نھی جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور چاندنی پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"مزاج تو اچھے ہیں سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

ان تینوں میں سے کسی نے اس کی مزاج پرسی کی رسید نہ دی۔

گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی جس کے دوران میں تینوں آدمی تیز تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اس کمرے سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ انہوں نے اپنے کیچڑ بھرے چپل نہیں اتارے تھے جس کی وجہ سے اجلی چاندنی پر دھبے ہی دھبے پڑ گئے تھے۔

"جبار خان!" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ "پتو س دو کہ پوچھو تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے۔"

"تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"باہر گیا ہے۔" رنگ علی نے کہا جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خان نے پوچھا۔

"سینما دیکھنے۔ سینما، بائیسکوپ۔" رنگ علی نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے باہر گیا ہے بائیسکوپ کا تماشہ دیکھنے۔"
"تو تماشہ دیکھنے جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔
"بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں۔" رنگ علی بولا۔ "وہ تو چشتی صاحب زبردستی لے گئے۔"
"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔
"کہتا ہے چشتی صاحب زبردستی لے گیا!"
"تو چشتی کے ساتھ جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا مگر اس کے خدوخال دونوں سے زیادہ درشت تھے۔ گلے میں سیاہ دھاریوں والے سرخ گلوبند کے دوبل دے کر، سرے چغے کے اندر کر رکھے تھے۔ اس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ چوڑا دہانہ، بائیں رخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔
"تو رنڈی منڈی کوئی نہیں تو اتنا روشنی کس واسطے کیا؟" اس نے رنگ علی سے پوچھا جب وہ بات کرتا تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو فقرے کے ادھ بیچ میں آدھا بند کر لیتا۔
رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔
"بولو!" جبار خاں نے کہا۔ "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اس کے اوپر کے ایک دانت پر پلٹینیم کا خول چڑھا تھا جو کافی گھس چکا تھا اور ہڈی نظر آنے لگی تھی۔
رنگ علی اب بھی خاموش رہا۔
"ہم اتنا سیڑھی کس واسطے چڑھ کے آیا؟" تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اپنے دونوں

ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلو بند لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی اور ناک پر ایک بڑا سا مستا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی ہو۔ ان میں سے کسی کی ڈاڑھی بھی ہفتے بھر سے کم کی منڈی ہوئی نہیں تھی۔

رنگ علی بے وقوفوں کی طرح ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"تو تمہارا منہ میں زبان نہیں ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔ پھر وہ پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صحبت خاں! اس کا منہ میں زبان نہیں ہے!"

"سرکار کیا عرض کروں" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی تو جاتی بھی نہیں وہ ——"

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے پوچھو کب آئے گا؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کب آئے گا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"شو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے سرکار۔ بس کوئی گھنٹے پون گھنٹے تک آجائیگا۔"

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے تین پاؤ گھنٹے میں آجائے گا۔"

"چشتی صاحب کئی دنوں سے سر ہو رہے تھے" رنگ علی بولا۔ "بائی جی ہر بار نہیں نہیں کرتی رہیں۔ آج تو بہت ہی سر ہو گئے۔ کہنے لگے فلم ایک نمبر ہے۔ بڑی مشکلوں سے سیٹیں ریزرو کرائی ہیں۔ قسمیں دینے لگے ——"

عین اسی وقت سیڑھیوں میں کچھ آہٹ ہوئی، تینوں آدمی چوکنے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جبار خاں!" صحبت خاں نے کہا۔ "اس پدر سگ کو کھوجیپ ہو جاؤ۔"

"چپ ہو جاؤ۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر حسین بخش وسّے کی بغل مارے باگیشوری کی دھن گنگناتا دہلیز پر نمودار ہوا۔ ان تینوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ پھر جوتی اتار کر کمرے میں داخل ہوا اور ان سے ذرا ہٹ کر چاندنی کے ایک سرے پر جہاں سارنگی غلاف کی ہوئی رکھی تھی، بیٹھ گیا۔

"سلام سرکار" حسین بخش نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ سارنگیے ہیں۔"

"سارنگیے کیا؟"

"سارنگی بجاتے ہیں۔ سارنگی جو ساز ہے۔"

"تو تو سازندہ کیوں نہیں کہتا۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"اور تم خود کیا کرتا ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"میں طبلہ بجاتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"تو تم بھی سازندہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"جبار خاں!" صحبت خاں نے جبار خاں سے کہا۔ "پوچھو ادھر کون کون رہتا ہے!"

"بائی جی، ہم دو استاد اور ایک نوکر حمن"۔ رنگ علی نے جواب دیا۔
"غو نوکر کدھر ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔
"بائی جی کے ساتھ گیا ہے"۔ رنگ علی نے جواب دیا۔
"ہوُں۔ ہوُں"۔
باہر بوندیاں کسی قدر تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ نیچے سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ جس میں گھنٹیوں کے سُر بھی شامل ہوتے سنائی دے جاتی۔ گیلی سڑک پر گھوڑے کا سم پڑتا تو بڑی پاٹ دار آواز نکلتی۔
"تم نے بولا نھی جان تین پاؤ گھنٹے میں آئے گا؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔
حسین بخش بیزار ہوا بیٹھا تھا، اس نے جواب دینا چاہا:
"کیا پتہ ——"
"تم مت بکو"۔ صحبت خاں نے درشتی سے کہا۔ پھر وہ رنگ علی کی طرف متوجہ ہوا۔
"تمہارا بائی تین پاؤ گھنٹے میں آجائے گا؟"
"آ تو جانا چاہیئے"۔ رنگ علی نے کہا۔
"چاہیئے نہیں جانتا"۔ صحبت خاں نے کہا۔ "ہاں کہو یا نہ"۔
"دیکھیئے سرکار"۔ رنگ علی نے کہا۔ "تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر پچاس منٹ۔ اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں ——"
"اگر مگر نہیں جانتا"۔ صحبت خاں نے کہا۔ "صاف بولو"۔
"آخر بات کیا ہے خان صاحب؟" حسین بخش سے چپ نہ رہا گیا۔ "کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے"۔

اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مُکا اس کے منہ پر مارا۔ اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر دہلیز کی طرف جانے لگا جہاں اس کا جوتا پڑا تھا۔

"او خنزیر!" جبار خاں نے کہا۔ "ٹھہرو، کدھر جاتا ہے؟"

حسین بخش نے ایک پاؤں جوتی میں ڈال لیا تھا، وہ ٹھہر گیا۔

"ادھر دیکھو" جبار خاں نے ڈپٹ کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا جس کا پھل آٹھ انچ سے کم لمبا نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس سے شعاعیں سی نکل رہی تھیں "اگر تم نیچے جانے کی کوشش کرے گا تو ہم تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ سن لیا۔ دروازے میں کنڈی لگاؤ اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔"

حسین بخش لمحہ بھر کھڑا رہا۔ پھر اس نے جوتی سے پاؤں نکال لیا اور دروازے میں کنڈی لگا کے اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"شاباش۔ شاباش!" صحبت خاں نے کہا۔ پھر وہ تیسرے آدمی سے کہنے لگا "گلباز خاں یار۔ تم نے تان سین کے بیٹے کو ناراض کر دیا۔ اب وہ ہم کو گانا نہیں سنائے گا۔"

"ہم اس کو سنائے گا" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اس کے گدگد کرے گا۔ تان سین کا بیٹا ہنسے گا۔ تان سین کا بیٹا پھر قوالی سنائے گا۔"

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا "اس کو بولو ہم گانا سننے نہیں آیا۔"

"پھر کیسے آنا ہوا سرکار؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"کیا کہنا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے کہا۔

"خو پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے پوچھو ہم کیوں آیا۔"

"خو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہتا" جبار خاں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہتا۔"

"مسکراتا ہے۔"

"مسکراتا ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ "خو تم مسکراتا ہے! مسخری کرتا ہے!"

"خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔" رنگ علی نے کہا۔ "میری کیا مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں!"

"خو تم اچھا آدمی ہے۔" صحبت خاں نے کہا۔

"تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے۔" گلباز خاں نے کہا۔ "وہ روتا ہے۔ تان سین کا بیٹا روتا ہے۔"

کلاک میں گھر گھر ہوئی اور اس نے ٹن ٹن کرکے بارہ بجانا شروع کیا۔ حسین بخش کے سوا سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگ دار فوٹو تھا جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی ادھیڑ عمر کی گانے والی، گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ناک پر بڑی سی

"پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے کہا۔

"خو پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" صحبت خاں نے کہا: "اس سے پوچھو ہم کیوں آیا۔"

"خو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہتا" جبار خاں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہتا۔"

"مسکراتا ہے۔"

"مسکراتا ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا: "خو تم مسکراتا ہے! مسخری کرتا ہے!"

"خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔" رنگ علی نے کہا: "میری کیا مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں!"

"خو تم اچھا آدمی ہے۔" صحبت خاں نے کہا۔

"تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے۔" گلباز خاں نے کہا: "وہ روتا ہے۔ تان سین کا بیٹا روتا ہے۔"

کلاک میں گھرر گھرر ہوئی اور اس نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجانا شروع کیا۔ حسین بخش کے سوا سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگ دار فوٹو تھا جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی ادھیڑ عمر کی گانے والی، گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ناک پر بڑی سی

لونگ تھی اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔
"خود دیکھو" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔" ادھر قلیان طلیان بھی ہے؟"
"قلیان تو نہیں حقہ ہے سرکار" رنگ علی نے کہا۔
"ہم حقہ نہیں پیئے گا۔"
"پان پیش کروں؟"
"ہم پان نہیں کھاتا۔"
"سگریٹ؟"
"سگریٹ؟ خیر چرس کا سگریٹ کا مضائقہ نہیں ہے۔"
"چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا سرکار!" رنگ علی نے کہا۔
"رنڈی منڈی نہیں، قلیان طلیان نہیں، چرس نہیں۔ یہ تمہارا کیسا طوائف کا مکان ہے؟" گلباز خاں نے کہا۔
"اچھا روغن کدو ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔
"روغن کدو تو نہیں" رنگ علی نے کہا" آنولے کا تیل ہوگا۔"
"خیر وہی لاؤ" صحبت خاں نے کہا۔
رنگ علی ایک الماری کے پاس گیا جس کے دونوں پٹوں کے چوکھٹوں میں دو لمبے لمبے آئینے جڑے ہوئے تھے اور الماری کھول کر تیل کی بوتل لے آیا۔
"دیکھو، تم بہت اچھا آدمی ہے" صحبت خاں نے کہا" تھوڑا سا تیل ہمارے سر پر ملو۔ پھر ہم تم کو بتائے گا ہم کس واسطے آیا۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی اتار دی۔ معلوم ہوتا تھا یہ پگڑی بہت دیر سے اس کے سر پر تھی کیونکہ کلاہ نے اس کی پیشانی پر گہرا نشان ڈال دیا تھا۔ اس کے سر پر بال

صرف کنارے کنارے تھے۔ بیچ میں چاند ایسی لگ رہی تھی جیسے انگور آیا ہوا پھوڑا۔
رنگ علی اس کی پیٹھ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر ڈالا اور سر پر ملنے لگا۔

"شاباش، شاباش" صحبت خاں نے کہا۔ "اب ہم تم کو بتائے گا کہ ہم کیوں آیا۔"
مگر وہ کہتے کہتے رک گیا اور گلباز خان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:
"گلباز خاں! خو تم بتاؤ یار، ہم تیل ملواتا ہے۔"
"ہم بتائے گا۔" گلباز خاں نے کہا۔ "مگر پہلے تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ دبائے۔"
"تان سین کا بیٹا" صحبت خاں نے کہا۔ "گلباز خاں کا ٹانگ دباؤ۔"
حسین بخش بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ سخت کوشش کر رہا تھا کہ ان کی طرف نہ دیکھے۔

"تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ نہیں دباتا!" گلباز خاں نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے ایک دھپ لگاؤ۔" صحبت خاں نے کہا۔

"ہم دھپ نہیں لگائے گا۔" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اس کا کان مروڑے گا۔ تان سین کا بیٹا اپنا کان ادھر کرو۔" اس نے حسین بخش سے کہا۔

"حضور معاف کر دیجیے۔" رنگ علی نے لجاجت سے کہا۔ پھر وہ حسین بخش سے مخاطب ہوا۔ "بھائی حسین بخش ضد نہ کرو، اٹھ بیٹھو اور خان صاحب کی ٹانگ دبا دو۔ اٹھو اٹھو، بچے نہ بنو، موقع محل دیکھا کرو۔"

حسین بخش سخت لاچاری کے ساتھ اٹھا اور گلباز خاں کے پاس بیٹھ کر اس کی ٹانگ دبانے لگا۔ آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہونے پائے تھے۔

"ہاہا" گلباز خاں نے حسین بخش کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دے کر کہا۔ "تان سین کا بیٹا اب اچھا ہو گیا۔ اب ہم بتاتے گا ہم کیوں آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

"تمہارا ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"اس کا نام ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"تو بس اس کا ناک کاٹنے آیا ہے!" گلباز نے کہا۔

"اس بچاری کا قصور؟" رنگ علی نے پوچھا۔ مالش کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے، چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آواز گلے میں اٹک گئی تھی۔

"قصور مصور کچھ نہیں" صحبت خاں نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو"

"پھر کیا بات ہے سرکار؟" رنگ علی نے گلباز خاں سے پوچھا۔

"ہم نے سنا اس کا ناک بہت لمبا ہے" گلباز خاں نے کہا۔ "اچھا نہیں لگتا۔ چھوٹا ہو جانے سے خوش رُو ہو جائے گا"

"خدا کے واسطے خان صاحب" رنگ علی نے گڑگڑا کر کہا۔ "ایسا غضب نہ کیجیئے گا۔ وہ بچاری تو بہت شریف ہے"

"جبھی تو ہم اس کو خوش رُو بنائے گا" گلباز خاں نے کہا۔

"ہم بہت کو خوش رُو بنا چکا ہے" جبار خاں نے کہا۔

گھڑی میں بارہ بج کر ۳۵ منٹ ہوئے تھے کہ سیڑھیوں میں کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تینوں آدمیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف

دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رنگ علی صحبت خاں کے قدموں میں گر پڑا۔

"رسول کے واسطے خان صاحب" اس نے بسورتے ہوئے کہا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم بہت ہی مسکین لوگ ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ گلباز خاں نے رنگ علی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور دروازے کے پاس لے گیا۔ پھر اسے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے خود اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پوچھو کون ہے؟" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون ہے؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو، دروازہ کھولو" کئی آوازیں سنائی دیں۔

"نام پوچھو" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"ارے بھئی میں ہوں سلیم اللہ" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "جلدی کھولو دروازہ۔"

"پوچھو آپ کے ساتھ کون ہے" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"اچھا شیخ صاحب ہیں!" رنگ علی نے کہا۔ "آپ کے ساتھ اور کون لوگ ہیں شیخ صاحب؟"

"میرے دوست ہیں بھئی" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "آخر تم دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔"

رنگ علی نے پلٹ کر گلباز خاں کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر نہیں کا اشارہ کیا۔ "شیخ صاحب معاف کیجئے گا" رنگ علی نے کہا۔ "اس وقت دروازہ نہیں کھل

سکتا۔ بائی جی مجرے گئی ہیں، صبح کو آئیں گی۔ اس وقت خان صاحب وزیر خاں کے ہاں سے کچھ بہوئیں آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لائیے گا۔"

اس پر سیڑھیوں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوا کی۔ پھر اترتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی ہوئی گم ہو گئیں۔

"شاباش"۔ صحبت خاں نے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔" تم بہت عقل مند آدمی ہے۔"

"عقل مند اس نے بنایا" گلباز خاں نے چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔" اگر پدر سگ ذرا بھی چوں کرتا تو ہم اس کا نوک اس کی پیٹھ میں اتار دیتا۔"

ایک بج گیا مگر ننھی جان نہیں آئی۔ تینوں آدمیوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ جبار خاں نے چغے کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی جس میں سے چٹکی چٹکی تینوں نے لی۔

سوا بجے صحبت خاں نے رنگ علی کو گلے سے پکڑ لیا۔

" او خنزیر بچہ، سچ بتاؤ۔" صحبت خاں نے پوچھا۔" وہ تماشے گیا ہے یا اور جگہ گیا ہے۔"

"قسم ہے پنج تن پاک کی خان صاحب!" رنگ علی نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" وہ تماشے ہی گیا ہے۔"

" پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" صحبت خاں نے پوچھا

" اللہ جانے کیوں نہیں آیا" رنگ علی نے کہا۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر خاموش رہ کر بولا۔ "میں جانوں چشتی صاحب اس کو اپنی کوٹھی لے گئے ہوں گے۔ اب تو وہ صبح ہی کو۔

آنے لگا۔"

"تم جھوٹ کہتا ہے" گلباز خاں نے کہا۔

"نہیں میں سچ کہتا ہوں" رنگ علی نے کہا۔

"ہم نہیں مانتا" گلباز خاں نے کہا۔

"آپ یہیں رہیے، پھر جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا" رنگ علی نے کہا۔

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

ڈیڑھ بجے تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمائیاں لیتے لیتے ان کے جبڑے تھک گئے تھے اور آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔ باہر بوندیاں تھم گئی تھیں تینوں میں آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ہم جاتا ہے" صحبت خاں نے کہا۔

جس وقت وہ دہلیز کے پاس پہنچے تو صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا:

"بخدا تمہارا ننھی جان کا قسمت بہت اچھا ہے۔ اچھا سلام۔"

"تان سین کے بیٹے کو بھی سلام" گلباز خاں نے کہا۔ اور وہ سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"یا خدا یہ کیا مصیبت ہے!" رنگ علی نے کہا۔

"ایسے کام کی ایسی تیسی" حسین بخش نے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر۔ میں تو کل ہی یہاں سے چل دوں گا۔ کسی فلم کمپنی یا ریڈیو میں نوکری کر لوں گا۔ اور جو نوکری نہ ملی تو ٹیوشن کر لوں گا۔ بھیک مانگ لوں گا مگر اس کوچے کا نام نہیں لوں گا۔"

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک دو بجے مکان کے نیچے ایک موٹر آ کے رُکی۔ اور پھر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ ذرا سی دیر میں ننھی جان ٹھمک ٹھمک کرتی سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چمن تھا جس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔

ننھی جان نے ساری کے اوپر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر اور کف لومڑی کی کھال کے تھے۔ سرخ ساری کی مناسبت سے پاؤں میں سرخ سینڈل تھے آدھے سر اور کانوں کو ایک سفید باریک سلک کے مفلر سے ڈھک رکھا تھا جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ ان لوؤں میں روپہلی ٹوپ دو ننھے ننھے پورے چاندوں کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کے رخساروں پر غازہ سرخ دھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی عمر بائیس تئیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ چال ڈھال سے وہ ایک القصّہ حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں سے مسکرانے والی، گہرے گہرے سانس لینے والی۔

رنگ علی اور حسین بخش کی نظریں سب سے پہلے بے ساختہ اس کی ناک پر پڑیں جس میں سرخ نگینے والی ایک کیل چمک رہی تھی۔

"شکر ہے آپ خیریت سے گھر پہنچیں" رنگ علی نے کہا۔

"سینما کے بعد کم بخت چشتی زبردستی ہوٹل لے گیا" ننھی جان نے کہا۔

"بہت اچھا ہوا" رنگ علی نے کہا۔

"تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟" ننھی جان نے پوچھا۔

بائی جی" حسین بخش نے کہا۔" مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیجئے"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"آپ گھر پر ہوتیں تو قیامت ہی آجاتی" رنگ علی نے کہا۔

"کچھ کہو تو آخر ہوا کیا ؟"

"آپ کے پیچھے تین پٹھان آئے تھے" رنگ علی نے کہا۔ "بڑے وحشی سے۔ ان کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ ہمیں مارا پیٹا، گالیاں دیں۔ بات بات پر چاقو نکال لیتے تھے۔ کہتے تھے ___"

"کیا کہتے تھے ؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"کہتے تھے۔ ان کے منہ میں خاک، ہم ننھی جان کا ناک کاٹنے آیا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔ پھر اس نے نگاہیں اپنی انگلیوں کے سرخ رنگے ہوئے ناخنوں پر گاڑ دیں۔

"میں نے کہا بھی،" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی رات کو واپس نہیں آئیں گی۔ پھر بھی ڈیڑھ بجے تک ہلنے کا نام نہیں لیا۔"

"میرے منہ پر اس زور کا مکا مارا کہ دو دانت ہل گئے۔" حسین بخش نے بسورتے ہوئے کہا۔

ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"آخر اب کیا ہوگا ؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"جانے کیا ہوگا !" ننھی جان نے کہا۔

"تھانہ میں رپٹ نہ لکھوا دیں ؟"

"کچھ فائدہ نہیں، الٹی بدنامی ہوگی۔ پھر پولیس والوں کے ناز مفت کے۔"

"کہیں اور نہ چل دیں ؟"

"کہاں ؟"

"کسی اور شہر!"

"کچھ فائدہ نہیں۔ سب جگہ ایسا ہی حال ہے۔"

"آخر پھر کیا کریں؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا!"

پل بھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ننھی جان نے انگڑائی لی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خلیفہ جی" اس نے رنگ علی سے کہا۔ "اس وقت تو تم لوگ آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد سب کواڑ بند کر دئے گئے تھے اور روشنی گل کر دی گئی تھی۔ دونوں استاد اور چمن فرش پر پاس پاس بستر بچھا کے لیٹ گئے تھے۔

"یہ پٹھان ضرور کسی کے بھیجے ہوئے تھے" رنگ علی نے حسین بخش سے کہا۔

"مگر کس کے؟" حسین بخش نے کہا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"ہو نہ ہو یہ چکر والے حاجی کی کارستانی ہے" رنگ علی نے کہا۔ "وہ بڈھا نکاح کے لیے بالی جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔"

"ہوں" حسین بخش نے خفیف آواز میں جواب دیا۔

پل بھر کو پھر خاموشی رہی۔

"یا شاید یہ نواب صاحب کی بدمعاشی ہے" رنگ علی نے کہا۔ "اس کو یہ چڑھتی

کرنلسٹر صاحب کیوں آتے ہیں؟

"ہوں!" حسین بخش نے پہلے سے بھی نحیف آواز میں جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"پھر خیال آتا ہے،" رنگ علی نے کہا "کہیں یہ اس حسین آباد کے کنگلے تعلقدار کی شرارت نہ ہو جس کو بائی جی نے بے عزت کر کے مکان سے اتار دیا تھا۔"

حسین بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے منہ دھسّے کے اندر کر لیا تھا اور لمبے لمبے سانس، جو ابھی خراٹے نہیں بنے تھے، لینے شروع کر دیئے تھے۔ مگر رنگ علی کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی:

"میں جانوں یہ راؤ صاحب کا کیا دھرا ہے۔ وہ کانا مارواڑی جو بائی جی کو بنارس لے جانا چاہتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔"

سنہ ۱۹۴۵ء

چکّر

سیٹھ چھنّا مل کا منیم چیلا رام صبح سے دوپہر کے بارہ بجے تک کوٹھی میں ہی کھاتے اور لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا۔ اس کے بعد وہ رقمیں اُگاہنے چلا جاتا۔ جون کی ایک دوپہر کو وہ اپنا کپڑے کا تھیلا لیے جس میں وہ کاغذات وغیرہ رکھا کرتا تھا، سیٹھ کے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ سیٹھ اس وقت گاؤ تکئے سے لگے بیٹھے پیچوان پی رہے تھے۔ انہوں نے چق کے اندر سے چلّا کر کہا:

"اے منیم جی! دیکھنا مال گودام جانا نہ بھول جانا۔ اور بنک میں روپیہ بھی سب جمع ہو جائے۔ اور ہاں وہ رجسٹریاں بھی تو ضروری ہیں۔ . . . . نسخہ اور کتابوں کی فہرست تو تم نے رکھ ہی لی ہو گی؟"

چیلا رام نے کہا: "جی ہاں"۔ اور وہ روانہ ہو گیا۔

اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پیر ابھی مضبوط تھے، معلوم ہوتا تھا جوانی میں صحت بہت اچھی ہو گی۔ اس کا لباس گرمی، سردی، ہر موسم میں، قریب قریب ایک ہی وضع کا تھا۔ کھدّر کا کرتا، موٹی ململ کی دھوتی، چارخانے کے کپڑے کا کوٹ۔ سر پر سیاہ کرسٹی ٹوپی، پاؤں میں نری کا جوتا۔ چونکہ اسے دن بھر چلتے پھرتے رہنا پڑتا تھا اس لیے یہ جوتا، بوٹ چپل وغیرہ کی نسبت، زیادہ پائدار ثابت ہوا تھا۔ اس جوتے نے شروع شروع میں اس کے پیروں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی مگر جب اس نے اس کے ٹخنوں اور پیروں کی انگلیوں پر سخت سخت سیاہ گٹے ڈال دیے تو تکلیف رفع ہو گئی۔

علاوہ ازیں ایک پرانا چھاتا جس کی موٹھ ہاتھی دانت کی اور فیشن ایبل بنی ہوئی تھی اس کے لباس کا جزو بن گیا تھا۔ یہ چھاتا در اصل سیٹھ چھنا مل کے بڑے لڑکے کا تھا جس نے بہت دن ہوئے اسے ردی کرکے پھینک دیا تھا سیٹھ کی نظر پڑ گئی اپنے ہاں اس کا کوئی مصرف نہ دیکھ کر انھوں نے اپنے منیم کو دے دیا۔ مگر چیلا رام کو اس چھاتے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو شاید سخت گرمی کے دنوں میں اسے بار بار دُور دُور کے کاموں پر بھیجتے ہوئے سیٹھ کو کچھ ہچکچاہٹ ہوتی ہوگی مگر چھاتے کے دان کے بعد اب ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہ گیا تھا۔

اس وقت سورج آسمان کے ٹھیک بیچ میں پہنچ گیا تھا۔ دیواروں کا سایہ گھٹتے گھٹتے اس قدر مختصر ہو گیا تھا کہ صرف ایک لکیر سی دکھائی دیتی تھی جو بیچ بیچ میں ٹوٹتی ہوئی سڑک کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ دھوپ کی تیزی اور شدت کا یہ حال تھا کہ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ بند ہونے پر بھی پپوٹوں کے اندر سے اپنے ارد گرد ایک سرخ سرخ اندھیرا سا گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گو چیلا رام نے چھاتا تان رکھا تھا مگر دھوپ چھاتے کے بوسیدہ کپڑے میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے کی طرف یوں لپک رہی تھی جیسے کسی سرسامی کا گرم سانس۔

چیلا رام چھاتے کو ٹیڑھا کرکے اپنے سر اور سینے کو لُو کے تھپیڑوں سے بچاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوٹھی سے کوئی دو سو قدم آگے نکل کر اس نے تھیلے کو چھاتے کی موٹھ میں لٹکا لیا اور کوٹ کی جیب میں سے بیڑیوں کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا نکالی اور بیڑی سلگا کر سوچنے لگا کہ آج کے مختلف کاموں کو کس ترتیب سے انجام دوں کہ کم سے کم چلنا پڑے۔

اس روز اسے چھ اسامیوں سے رقمیں وصول کرنی تھیں۔ ان میں سے دو کے گھر

تو زیادہ دُور نہیں تھے البتہ باقی چار شہر کے چار مختلف سروں پر رہتی تھیں۔ جب تک ان چھوٹوں سے روپیہ وصول نہ ہو جائے وہ بنک نہیں جا سکتا تھا اور بنک تین بجے کے بعد لین دین بند کر دیتا تھا۔ پھر بعض ضروری رجسٹریاں تھیں جن کے متعلق سیٹھ نے تاکید کر رکھی تھی کہ انہیں آج ہی ڈاک میں بھیج دیا جائے۔ چونکہ ڈاک خانوں میں عموماً بھیڑ رہا کرتی ہے اس لیے کم سے کم ایک گھنٹہ اس کے لیے چاہیے تھا۔ پھر اسے ریل کے مال گودام میں جانا تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے کا یہ کام بھی تھا۔ علاوہ ازیں سیٹھانی کے لیے نسخہ بھی بنوانا تھا۔ اور سیٹھ کے منجھلے لڑکے کے لیے، جس نے چھٹی جماعت پاس کر لی تھی، کتابیں خریدنی تھیں۔

بھلا ہو چیلا رام کے نری کے جوتے کا، اس کے بیڑیوں کے بنڈل کا، اور ان پانی کی سبیلوں کا جنہیں کمیٹی نے بازاروں میں اور بعض نیک دل دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانوں کے پاس لگوا رکھا تھا کہ اس نے چھ بجتے بجتے سب کام نمٹا لیے۔ وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا جس طرح کوئی دُور دراز ملک کا رہنے والا منچلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کے ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے پر فرض کر لیتا ہے۔ جب لُو زیادہ ستانے لگتی تو وہ دھیان بٹانے کے لیے بیڑی سلگا لیتا۔ جب بیڑی کے دھوئیں سے حلق سوکھ جاتا تو پیاؤ سے پانی پی لیتا۔ جب جوتے میں گرد بھر جاتی یا وہ تپ اٹھتا تو کسی سایے والی جگہ میں کھڑے ہو کر جوتا جھاڑ لیتا۔ اور اگر کوئی سرکاری نل قریب ہی ہوتا تو جوتا اتار کر پاؤں بھگو لیتا۔ جس طرح بعض دفعہ گاڑی بان گاڑی کے پہیوں کے گرم ہو جانے پر پانی ڈال کر انہیں ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

جب وہ کوٹھی سے نکلا تھا تو اسے آج کے کام پہاڑ سے دکھائی دیتے تھے مگر اب

اسے خود حیرانی ہو رہی تھی کہ اس نے یہ سارے کام کس طرح انجام دے لیے اور پھر یہ کام سیٹھ کے حسب منشا خوش اسلوبی سے ہو گئے تھے۔ البتہ ایک آسامی نے اسے دیر تک ٹھہرائے رکھا تھا اور پھر رقم بھی نہیں دی تھی۔ اسی طرح نسخہ بنوانے کے لیے بھی اسے کافی دیر کھڑا رہنا پڑا تھا کیونکہ جس ڈسپنسری سے سیٹھ چھپا مل کا حساب تھا اس کا کمپونڈر چیلارام کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کا نسخہ عموماً سب سے آخر میں بنایا کرتا تھا۔ ہاں ڈاک خانے میں اسے اندازے سے بہت کم ٹھیرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے ڈاک خانہ چنا ہی ایسا تھا جس کے آس پاس آبادی نسبتاً کم تھی اور بہت سے لوگ اس کے وجود تک سے ناواقف تھے۔ مال گودام میں بھی اس کی جلد ہی خلاصی ہو گئی کیونکہ بلٹیاں ابھی نہیں آئی تھیں۔

جس وقت وہ سیٹھ کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو دھوپ میں وہ پہلے جیسی حدت نہیں رہی تھی البتہ سڑکوں پر چھڑکاؤ کی وجہ سے ابخرات اٹھ رہے تھے جس سے سخت حبس ہو گیا تھا۔ دور ہی سے اسے سیٹھ کے کمرے سے ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں اور وہ دروازے کے باہر چق کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وہ ان آوازوں کو خوب پہچانتا تھا۔ ان میں ایک تو سیٹھ بانکے بہاری تھے جو سیٹھ چھپا مل کے پڑوس میں انہی کی طرح مگر ذرا چھوٹے پیمانے پر ساہوکارہ کرتے تھے اور سیٹھ کے دور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ہر روز چھ بجتے ہی اپنا کاروبار بند کر دیتے اور سیٹھ چھپا مل سے خوش گپیاں کرنے آموجود ہوتے۔ ان کے ساتھ عموماً ان کا ایک ٹھیکہ دار دوست بھی آیا کرتا۔ یہ شخص بڑا لطیفہ گو اور چرب زبان تھا اور اپنی انہی خوبیوں کے باعث بڑے بڑے حکام تک اس کی رسائی تھی۔

علاوہ ازیں سیٹھ چھپا مل کا بہنوئی جو ایک بے پروا اور آوارہ مزاج آدمی تھا اور جو دیوالیہ ہو چکا تھا اور اب سیٹھ کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا تھا بڑے شوق سے ان خوش گپیوں

میں حصہ لیا کرتا۔ خود سیٹھ جی بھی ان کے دلدادہ تھے کیونکہ دن بھر اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے یا سوتے رہنے سے وہ اکتا جاتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی یہ مختصر سی محفل گھر بیٹھے ان کے لیے تفریح کا سامان مہیا کر دیتی تھی۔

چیلا رام دو تین مرتبہ دروازے کے باہر کھڑے کھڑے کھانسا مگر سیٹھ جی اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں ایسے مشغول تھے کہ انہوں نے آواز نہ سنی۔

اس وقت سیٹھ بانکے بہاری کا ٹھیکہ دار دوست تناسخ کے مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"ہنسی مذاق کو چھوڑ کر آپ ذرا اس مسئلے پر بھی تو غور کیجیے۔ آج کل جس کو سنو یہی کہہ رہا ہے کہ اس کلجگ کے زمانے میں پاپ بہت بڑھ گیا ہے اور اب دنیا میں صرف مہاں پاپی ہی بستے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو دنیا کی آبادی روز بروز کم ہوتی جانی چاہیے تھی۔ کیونکہ جب کوئی مہاں پاپی مر جاتا ہے تو آواگون کی رُو سے وہ دوبارہ انسان کے روپ میں جنم نہیں لیتا بلکہ انسان سے گھٹیا درجے یعنی پشو پکشی کی جون دھارن کرتا ہے اور اس طرح آج دنیا میں روز بروز انسان کم اور پشو پکشی زیادہ ہونے چاہییں تھے مگر یہاں معاملہ الٹا ہے سیٹھ جی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ پاپ نہیں مہاں پن ہے اور جبھی تو ہم بار بار انسان کا روپ ——"

اچانک ٹھیکہ دار کی نظر دروازے پر پڑی اور وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور پھر سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ چیلا رام سے زیادہ دیر تک دروازے کے باہر کھڑا نہ رہا جا سکا تھا اور وہ ایک اضطراری حرکت کے ساتھ چق اٹھا کر اندر داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور

سورت سے عجیب ہونق پن سا برس رہا تھا۔ اس کی کڑبڑی مونچھیں، پلکیں اور بھوویں گرد سے اٹی ہوئی تھیں اور آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی تھیں گویا دُکھنے آئی ہوں۔ دن بھر دھوپ اور لُو کے تھپیڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سُرخ ہو گئی تھی جیسے مرگھٹ کے اس مردے کی جس کے چہرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو۔

اس کی کرسٹی ٹوپی کا کنارہ بھیگا ہوا تھا اور اس کی بغلوں سے اس قدر پسینہ بہا تھا کہ کوٹ کی آستینیں چھاتی سے لے کر کہنیوں تک تر تھیں۔ علاوہ ازیں اس کی دھوتی پر جا بجا کیچڑ کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اس قدر بے جان معلوم ہوتا تھا کہ ہر لحظہ یہ گمان ہوتا، اَب گرا کہ اَب گرا۔

یہ دیکھ کر کہ اس کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ مگر اس نے آگے بڑھ کر تھیلا فرش پر رکھ دیا اور اس میں سے کتابیں، سیٹھانی کا نسخہ، دوا کی شیشی، رجسٹری اور بنک کی رسیدیں اور دوسرے کاغذات وغیرہ نکال نکال کر سیٹھ کے سامنے رکھنے لگا۔ وہ بلٹیوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سیٹھ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے اسے روک دیا اور کسی قدر ملائمت سے کہا:

"منیم جی! اس وقت تو تم گھر جاؤ، صبح دیکھا جائے گا۔"

پیلا رام کا گھر سیٹھ کی کوٹھی سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا جس وقت وہ گرتا پڑتا گھر پہنچا، خاصی شام ہو چکی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے دھوتی کے سوا سب کپڑے اتار ڈالے اور مکان کے باہر احاطے میں نکل آیا۔ اس کے دروازے کے پاس دیوار کے سہارے ایک کھٹیا کھڑی تھی۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ یہ کس کی ہے۔ جھٹ وہیں بچھا، اس پر بے سُدھ ہو کر گر پڑا۔

شاید اس کی بیمار بیوی نے، جو چولھے کے پاس میٹھی سوئی بنا رہی تھی، اس سے کچھ کہا تھا۔ مگر اسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ کیا کہا گیا۔ اس کی چھوٹی لڑکی آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ شاید اس نے اسے درشتی سے پرے ہٹا دیا تھا۔ یا شاید وہ خود ہی سہم کر پرے ہٹ گئی تھی۔

پندرہ منٹ تک وہ آنکھیں بند کیے کھٹیا پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کے حواس بجا ہونے شروع ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً پنڈلیوں اور کمر میں اینٹھن اور میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا اور وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ وہ کبھی اس کروٹ لیٹتا اور کبھی اس کروٹ۔ کبھی ٹانگوں کو اکڑا کر سخت کر لیتا اور پھر آہستہ سے انہیں چھوڑ دیتا۔ کبھی شانوں کو زور سے سکیڑ کر سر کے پیچھے ڈال دیتا، کبھی پنڈلیوں کو رانوں سے ملا کر بھینچ لیتا۔ کبھی ہاتھوں کو اندر کی طرف موڑتا، کبھی پیروں کے پنجوں کو پھیلا کر سیدھا کرتا۔ ان حرکات سے جب کبھی اس کا کوئی جوڑ خود بخود چٹخ اٹھتا تو اسے بہت آرام محسوس ہوتا۔

یوں لوٹنے پوٹنے سے اس کی طبیعت اور بھی سنبھل گئی اور اسے نیند آگئی۔ مگر وہ زیادہ دیر نہیں سویا تھا کہ اپنے سرہانے کچھ شور سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کا ہمسایہ رولو دن بھر تانگا چلانے کے بعد واپس آچکا تھا۔ تانگے میں سے گھوڑے کو کھول لیا گیا تھا اور زین اور ساز اتار کر صرف ایک رسی اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی جسے رولو نے پکڑ رکھا تھا۔ اور ایک مالشیا کپڑے کی ایک گدی زور زور سے اس کی کمر اور پچھلی ٹانگوں پر رگڑ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کام میں مالشیے کا کافی زور لگ رہا تھا۔ کیونکہ ہر رگڑ کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ "ہوں" نکل جاتی تھی۔ خود رولو کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جس سے وہ گھوڑے کی گردن

بغلوں اور پیٹ پر سے پسینہ پونچھا جاتا تھا۔

رسی کا جو حصہ گھوڑے کے گلے میں پڑا ہوا تھا اس میں پیتل کے نکل گئے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑا بار بار پھنکارتا، اپنا سر بے چینی سے اوپر کو جھٹکتا اور ہر بار یہ گھنگرو اندھیرے میں چاندی کی سی چمک دکھلاتے ہوئے زور سے بج اٹھتے۔ گھوڑا رہ رہ کر اپنی اگلی ٹانگوں کے سم بھی زمین پر مار رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھڑک کر زور زور سے ہنہنانے اور دولتیاں بھی جھاڑنے لگتا۔ ایسے موقع پر رولو اسے چمکارتا اور کہتا: "بس بس، میرے بیٹے، میرے لعل!"

چیلارام کچھ دیر تک دلچسپی سے یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی بیوی نے کوٹھڑی میں سے چلّا کر کہا: "بھوجن کر لو!"

چیلارام نے کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے اب کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا:

"بھوجن کبھی کا تیار ہو چکا ہے۔ اب اندر آ جاؤ نا!"

چیلارام اب بھی خاموش رہا۔

وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہو

۱۹۴۵ء

اندھیرے میں

"مجھے چھوڑ دو ـــــ مجھے چھوڑ دو . . . . اب میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گا۔"

بڈھے نے اپنے کمزور اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوجوان کی قمیص کا دامن اور بھی مضبوطی سے تھام لیا اور بڑی لجاجت سے کہا:

"بس اب غصہ تھوک بھی ڈالو بیٹے! کہہ جو دیا اب کبھی نہیں پیوں گا۔ لو میں توبہ کرتا ہوں۔"

"اونہہ توبہ!" نوجوان نے تنک کر کہا۔ "اس دن بھی تو توبہ کی تھی . . . وہ پھر اسی دن! نہیں نہیں۔ یہ اب تم سے چھٹ نہیں سکتی۔ تم نے سوچا ہو گا میرا بیٹا جلسے میں گیا ہے وہ رات کو کہیں بارہ بجے آئے گا۔ بس میدان خالی دیکھا اور وہی پرانی وحشت لگ گئی۔ . . . کیا تم چاہتے ہو کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی کڑھ کڑھ کر مر جاؤں۔"

مارے رقت کے نوجوان کا گلا بھر آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک آنسو پھسل کر اس کی آنکھ سے بہہ نکلا اور اس کی چھوٹی سی خوبصورت سیاہ ڈاڑھی میں الجھ کر رہ گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا:

"مجھے جانے دو . . . ."

"کیسے جانے دوں بیٹے! تمہارے سوا اس دنیا میں میرا ـــــ"

بڈھا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اسے زور کی کھانسی اٹھی۔ کھوں کھوں کھوں کھوں، کھوں کھوں، کھوں۔ نوجوان کی قمیص کا دامن خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس

نے دونوں ہاتھوں سے چھاتی کو پکڑ لیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ گردن کی رگیں پھول کر رسی کی طرح ہو گئیں۔ آخر دو تین منٹ کے بعد کھانسی تھم گئی۔ مگر اب اس میں بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ بے دم ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ نوجوان اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور چاہتا تو کبھی کا جا سکتا تھا مگر نہ تو وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور نہ باپ کی چارپائی ہی کے پاس گیا۔

کوٹھڑی میں پہلے ہی شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی اس پر اس کھانسی نے بڈھے کے منہ سے پے در پے شراب میں بسا ہوا سانس خارج کر کے اس فضا کو اور بھی آلودہ کر دیا تھا۔ نوجوان اس کی بھبک کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں جب بڈھے کے حواس ذرا بجا ہوئے تو وہ چارپائی سے اٹھا اور نوجوان کے پاس آ کر ملامت آمیز لہجہ میں کہنے لگا:

"میرا . . . . . میرا یہ حال۔ اور تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو!"

نوجوان لمحہ بھر گردن نیچی کیے خاموش کھڑا رہا۔ اور پھر بولا:

"میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ شراب نے تمہارے جگر کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر کہہ چکا ہے کہ اب اس کا ایک قطرہ بھی تمہارے لیے زہر ہے۔ مگر تم ہو کہ . . . . . بس نہیں یہاں رہوں گا۔ اور نہ تمہاری یہ حالت دیکھوں گا۔" جس وقت نوجوان یہ کہہ رہا تھا تو اس کے لہجہ میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تھا بلکہ اس کی جگہ ایک تاسف نے لے لی تھی۔

باپ نے خطاکارانہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور پھر نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے دل ہی دل میں کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے، پھر بولا:

"آج میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اب کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں نہیں

سمجھتا تھا کہ تم اس سے اس درجہ نفرت کرنے لگے ہو۔ صرف ایک موقع اور دو ۔۔۔ اب کے پیوں گا تو تمہیں اختیار ہوگا، جہاں جی چاہے چلے جانا۔"

دونوں چند لمحے تک خاموش رہے۔

"اچھا ایک بار اور سہی" بالآخر نوجوان نے سکوت کو توڑا" مگر نہیں وہ بوتل میرے حوالے کر دینی ہوگی جو میرے اچانک آجانے پر تم نے چھپالی تھی۔"

"برخوردار" بڈھے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" تم اسے لے کر کیا کروگے۔ میں کسی اپنے دوست کے ہاتھ بیچ ڈالوں گا۔ تمہاری تنخواہ میں سے آنہ آنہ، دو دو آنے بچا کر میں نے چار روپے جمع کئے تھے جس کی یہ کم بخت بوتل خرید لی۔ میں نے اس میں سے صرف دو ایک پیگ ہی پیئے ہیں۔ تین نہ سہی دو ڈھائی روپے تو کہیں نہیں گئے جو اس تنگ دستی میں ہمارے کام آئیں گے۔"

"نہیں نہیں" نوجوان نے جلدی سے کہا" اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ۔۔۔ لاؤ مجھے دے دو۔"

اس پر بڈھے نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔ بیٹے کی اس دخل اندازی سے اس کے پینے کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر اب ہنگامے کو فرو ہوتے دیکھ کر اس کی طبعی خوش باشی اور زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

"میری جان" اس نے کہا" تم فکر نہ کرو۔ میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ اگر پیوں تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ میں صبح ہوتے ہی اسے خلیفہ کے پاس چلتا کردوں گا۔ دو روپے تو وہ ہنس کر دے دے گا ۔ ۔ ۔ میری بات مانو میں اسے بالکل منہ نہیں لگاؤں گا۔"

زبان سے تو وہ یہ کہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے ایک پیاس، ایک ترساوٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں" اس کے بیٹے نے یکبارگی درشت لہجہ میں کہا: "میں اسے گھر ہی نہیں رہنے دوں گا۔ اگر تم مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اسے میرے حوالے کر دو۔" پھر باپ کو کچھ پس و پیش کرتے دیکھ کر وہ بولا: "سنو اگر تمہیں اس کے بیچنے ہی کا خیال ہے تو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔"

اور اس نے باپ کو بتایا کہ اس کے دفتر کا ایک چپراسی نوکری چھوڑ کر آجکل ایک صاحب کا بیرا بنا ہوا ہے۔ اس کی معرفت یقیناً اسے بیچا جا سکے گا۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ اسے بیچ نہ سکا تو واپس لے آئے گا۔ اور پھر اس کے باپ کو اختیار ہو گا کہ وہ جس کے ہاتھ چاہے اسے بیچ ڈالے۔

بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر باپ نے زیادہ ٹال مٹول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بڑی حسرت کے ساتھ صندوق کے پیچھے سے بوتل نکال کر اسے دے دی۔ یہ سنگترے کا سٹرا تھا۔ اس کا باپ اس میں سے ابھی آٹھواں حصہ بھی نہیں پینے پایا تھا۔ نوجوان نے اس کے ارغوانی رنگ پر نفرت کی نگاہ ڈالی۔ پھر اسے ہاتھ میں تھام کمبل کی بغل میں چھپا لیا اور کوٹھڑی سے نکل آیا۔ صحن میں سے گزر رہا تھا کہ باپ کی آواز سنائی دی:

"دیکھنا میرے بیٹے ضائع نہ کر دینا۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ دو تین روپوں میں آج کل سینکڑوں کام۔ . . . ." وہ اب اتنی دُور نکل گیا تھا کہ باپ کے باقی الفاظ نہ سن سکا۔

یہ جنوری کے وسط کی ایک سرد رات تھی۔ نو بج چکے تھے۔ بازاروں کی چہل پہل کم ہو گئی تھی۔ بہت سے دکاندار دکانیں بڑھا چکے تھے۔ نوجوان کچھ سوچے سمجھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ دو ایک راہگیروں سے وہ بھڑتے بھڑتے رہ گیا۔ ایسے موقع پر اس نے اضطراری طور پر بازوؤں کو سکیڑا اور گردن جھکا کر کمبل میں چھپی

ہوئی بوتل کو اس طرح بچا لیا جس طرح کوئی روگی اپنے جسم کے کسی پکے ہوئے پھوڑے کو ٹھیس لگنے سے بچاتا ہے۔

نوجوان اپنی دھن میں محو نہ جانے کن کن بازاروں اور گلی کوچوں کو طے کر چکا تھا مگر ابھی تک وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اسے جانا کہاں ہے۔ آخر جب اس نے اپنے کو چاوڑی بازار میں پایا تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ . . . شاید اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال تھا کہ اگر اس جنس کے خریدار مل سکتے تو بازارِ حسن ہی میں مل سکیں گے اور اس کے قدم آپ سے آپ اسے اس طرف لے آئے تھے۔ مگر کیا وہ سچ مچ اس چیز کو بیچنے کے ارادے سے نکلا تھا؟

اس خطرناک چیز کا جو شاید اس کے باپ کا آخری جام ثابت ہوتی گھر میں رہنا اسے کسی صورت منظور نہ تھا۔ اور وہ جوش میں بھرا ہوا، کچھ سوچے سمجھے بغیر، باپ کی ہر بات ماننے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ بوتل اس کے حوالے کر دے۔ سودا کرنا تو ایک طرف اگر کوئی اس سے یہ کہتا: "میاں صاحبزادے میں جانتا ہوں کہ تم بہت متقی و پرہیزگار ہو اور یہ جو ذلیل کام تم نے اپنے ذمے لیا ہے اس کا تمہیں قربانی اور شہادت کا سا اجر ملے گا۔ . . . . . تم نے اپنے کمبل میں جو شراب کی بوتل چھپا رکھی ہے اور جس میں سے تھوڑی سی خرچ بھی ہو چکی ہے، لاؤ پورے داموں میرے ہاتھ بیچ ڈالو کیونکہ ٹھیکہ بند ہو چکا ہے۔" پھر بھی شاید وہ راضی نہ ہوتا۔

وہ تیزی سے اس بازار سے گزر گیا اور چوک میں پہنچا جہاں سے نئی دلی کو راستہ جاتا تھا۔ چوک میں پل بھر کے لیے رک کر سوچنے لگا، اب کدھر جاؤں کہ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا:

"آداب عرض مولانا۔ کہو بھئی یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ مناظرے میں نہیں گئے؟"

نوجوان کا دل یک لخت زور سے دھڑک اٹھا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں
بولا:

"والد صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یکبارگی علیل ہو گئے۔ اچھا یعنی کل دفتر میں
مل گے، مجھے ایک ضروری کام سے نئی دلی جانا ہے"

یہ کہتے ہوئے اس کے قدم نئی دلی کی طرف اٹھ گئے۔ اگر اس کے دفتر کے اس
احمق کو شبہہ بھی پڑ جاتا کہ جس کو اس نے "مولانا" کہہ کر خطاب کیا ہے وہ اس وقت
اپنے کمبل کے نیچے کیا چھپائے لیے جا رہا ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ملاقات سے اسے صورت
حال کی نزاکت کا اچانک احساس ہو گیا۔ نئی دلی کا نام محض دوست کو ٹالنے کے لیے
اس کی زبان سے نکل گیا تھا مگر اب وہ سچ مچ نئی دلی جا رہا تھا۔ اور کچھ نہ سہی وہاں ایسی
اچانک ملاقاتوں کا امکان تو کم ہو گا۔ اور پھر وہاں وہ کناٹ پلیس کے کسی الگ تھلگ
گوشے میں بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کر سکے گا۔

کوئی گیارہ کا عمل ہو گا کہ وہ کناٹ پلیس کے پارک میں پہنچا۔ مسلسل دو گھنٹے چلتے رہنے
سے تھک گیا تھا۔ ہاتھ دکھنے لگے تھے جن میں وہ باری باری بوتل کو اٹھاتا لایا تھا۔
ایک درخت کی نیم تاریکی میں ایک خالی بنچ دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ بوتل بنچ پر رکھ دی
اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگا۔

اس وقت شدت کا جاڑا پڑنے لگا تھا جس میں باغ کی سیل نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا
اس نے اپنے جسم کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹ لیا۔ دل میں اب پہلا سا جوش اور غصہ نہیں
رہا تھا بلکہ اپنی اس مہم پر رہ رہ کے ہنسی آ رہی تھی۔ بھلا وہ اور شراب کا سودا! یہ
خیال ہی مضحکہ انگیز تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کے دفتر کے ایک چپڑاسی نے کسی صاحب کی
نوکری کر لی تھی مگر اتا پتا ایک طرف وہ تو اس کے مالک کا نام بھی نہیں جانتا تھا! اور پھر

اگر کسی لطیفۂ غیبی سے اسے وہ بیرا مل بھی جاتا تو کیا اس کے سامنے اس چیز کا نام لینے کی بھی اسے جرأت ہوتی . . . . . .

اسے بنچ پر بیٹھے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہوگیا مگر بوتل کو ٹھکانے لگانے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی۔ اس وقت کناٹ پلیس خاصا اجاڑ معلوم ہوتا تھا۔ البتہ بعض سینما گھروں اور بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں کی روشنیاں دور سے جگمگاتی ہوئی ابھی تک نظر آرہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ روشنیاں بھی گل ہونے لگیں ساتھ ہی ٹاؤن ہال کے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔

اس نے سوچا، اس بوتل کو گھر لے چلوں اور چپکے سے اپنے صندوق میں بند کردوں دو چار دن میں جب والد کے دماغ سے اس کا خیال نکل جائے گا تو اسے ضائع کردوں گا۔ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرکے وہ اٹھنے ہی کو تھا کہ اتنے میں اسے کچھ فاصلے پر دو سایے سے دکھائی دیئے جو لان میں سے گزرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ نوجوان نہ جانے کس جذبے کے تحت وہیں بیٹھا رہا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے دیکھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ دونوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ مرد سر سے ننگا تھا اور عورت نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ چاندنی میں عورت کا چہرہ موتی کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور مرد نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے جسم سے بھینچ رکھا تھا۔ وہ آکر دوسری بنچ پر بیٹھ گئے جو درخت کے تنے کے اس طرف تھی۔ مرد بار بار عورت کے رخسار و پیشانی پر بوسے دیئے جا رہا تھا۔ نوجوان کچھ گھبرا سا گیا۔ مگر وہ لوگ اپنی دھن میں ایسے مست تھے کہ نہ تو انہوں نے نوجوان کو دیکھا اور نہ یہ معلوم ہی ہونے پایا کہ تنے کے دوسری طرف کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔

نوجوان ان کی باتیں بخوبی سن سکتا تھا۔

"میری جان" مرد کہہ رہا تھا" تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آج کی رات میری زندگی میں کس درجہ مسرت کی رات ہے۔"

"کیسی عجیب بات!" عورت کے لہجہ میں تعجب اور تاسف ملا جلا تھا۔ "اب سے چار گھنٹے پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے۔ اور اب . . . ."

"آہ! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو" مرد کراہا۔ "جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے ــــ میں ہمیشہ تخیل کے نیلگوں افق پر تمہیں دیکھا کرتا تھا۔ تم اپنے درخشاں چہرے کے ساتھ ایک چاند کی طرح ابھرتیں اور میری تیرہ زندگی جگمگا اٹھتی۔ تم میرے لیے کبھی اجنبی نہ تھیں ــ میں روز و شب تمہاری تمنا کرتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تمہیں پا لوں گا۔ اور میرا جذبہ اس قدر شدید ہوگا کہ تم اسے ردّ نہ کر سکو گی۔

"آج جب میں نے تمہیں کافی ہاؤس کے ایک الگ تھلگ گوشے میں کافی پیتے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ میں نے دل میں کہا، بے شک یہی ہے' میری روح، جس کے لیے میرا جسم اتنے عرصے سے بھٹکتا پھرتا تھا۔ اور میں بے جھجک تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تم حیرانی سے میرا منہ تکنے لگیں۔ میں نے تم سے اجازت بھی طلب نہ کی اور تمہارے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک ہم مبہوت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آہستہ سے تمہاری کلائی تھام لی اور تم میرے ساتھ کافی ہاؤس سے اُٹھ آئیں . . . . ایں تم رو رہی ہو؟" اور یہ کہتے کہتے مرد نے عورت کی گردن پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔

چند لمحے خاموشی رہی جس کے دوران عورت کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

"میں نہیں کہہ سکتی" آخر عورت نے سسکیوں پر قابو پا کر کہنا شروع کیا ــ" میں کیوں تمہارے ساتھ اٹھ کر چلی آئی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا کر رہی ہوں۔ میں نے یہ بھی تو نہ سوچا کہ تم میرے متعلق کیا خیال کرو گے۔ شاید تم مجھے بھی ان آوارہ عورتوں میں سے سمجھتے ہو گے جو شکار کرنے نکلتی ہیں۔ لیکن مجھے پروا نہیں۔ تم جو چاہو مجھے سمجھو، یہ یقینی امر ہے کہ ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں اس اجنبی شہر میں آج ہی آئی ہوں اور شاید کل ہی چلی جاؤں ۔"

جس وقت عورت یہ کہہ رہی تھی تو نوجوان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی میٹھا اور درد بھرا نغمہ سن رہا ہے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نوجوان چونک سا اٹھا۔ عورت کی سریلی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"آہ! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو۔" ادھر مرد کہتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ عورت کی ایک ایک انگلی کو، پوروں کو، ناخنوں کو بھی چومتا جاتا تھا۔ آؤ ہم اپنے تئیں بھول جائیں میری زندگی خوابیدہ تھی۔ تم ایک سہانے خواب کی طرح آئیں اور وہ خواب حقیقت بن گیا۔ . . . . ایں تم کانپ رہی ہو؟ سردی لگ رہی ہے . . . . ؟ اے کاش کہیں سے اور وسکی مل سکتی۔ صرف چند گھونٹ تمہیں گرما دیتے . . . ."

وسکی کا نام سن کر نوجوان اچھل پڑا۔ ان کی باتوں نے اس پر ایک نشہ طاری کر دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانیوں کو بھول گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے محبت کے لفظ کو لغت کے باہر دیکھا اور اس کے معنی فوراً اس کی سمجھ میں آ گئے۔ وہ اب تک ان باتوں سے بے خبر تھا، ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہا تھا جس میں کسی قسم کی رنگینی یا مسرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی اس راز و نیاز کی باتوں نے اسے ایسا لبھا لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوں ڈبڈبا آئے تھے اور سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہوا کہ دفتر میں صبح سے شام تک موپا ایک کرنے اور گھر میں باپ سے

لڑنے جھگڑنے کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مقصد ہیں اور اس کے دل میں یکبارگی عجیب عجیب ولولوں نے جنہیں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہیں، ایک ہیجان برپا کر دیا۔

"میری روح، میری راحت!" مرد کہے جا رہا تھا: "تمہارے دانت بج رہے ہیں۔ افسوس سب ہوٹل بند ہو چکے ہیں۔ . . . ."

نوجوان نے دل میں کہا۔ اگر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور بغیر ایک لفظ کہے بوتل ان کے حوالے کر کے چلا آؤں تو کیسا رہے۔ دکی نہ سہی شراب تو ہے! اور وہ لوگ کسی قدر تامل کے بعد ضرور اسے قبول کر لیں گے . . . . . مگر اسے جرأت نہ ہوئی۔

"میری جان مجھ سے لپٹ جاؤ، یوں سردی نہیں لگے گی!" اور مرد نے عورت کو خود ہی لپٹا لیا۔

"بس اب مجھے جانا چاہیے۔ میری دوست، جس کے ہاں میں ٹھہری ہوں، پریشان ہو گی۔ میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے گھر سے نکلی تھی مگر اب پانچ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ افوہ سردی واقعی بہت بڑھ گئی ہے . . . ."

اس عورت کی آواز کی نغمگی نے نوجوان کو ہمت دلائی اور وہ ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کھانسا۔ مگر وہ لوگ اپنی اپنی دھن میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہوں نے سنا تک نہیں۔ نوجوان نے دل کو مضبوط کیا اور ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو اٹھ کر ان کے پاس چلا جائے اور اس مسرت کی قیمت کے طور پر جو اسے ان کی باتیں سن سن کر حاصل ہوئی تھی یہ بوتل ان کی نذر کر دے۔ اس نے بوتل سنبھالی ہی تھی کہ عین اسی وقت وہ دونوں بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر جس طرف سے آئے تھے جھومتے جھامتے پھر اسی سمت چل

دیتے۔

نوجوان ان کے جانے کے بعد دس منٹ تک بالکل گم سم بیٹھا رہا۔ اس موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا اسے زیادہ افسوس نہ ہوا کیونکہ اب ایک اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ اس کے درپیش تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں اس نے اپنی روح کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا تھا ـــــ اس روح کو جسے مذہبی، اخلاقی اور سماجی فرائض کی طنابوں نے کس رکھا تھا۔ یہ طنابیں تھوڑی دیر کے لیے ڈھیلی ہو گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھٹی ہوئی نڈھال روح سسکتی ہوئی زمین پر آ رہی تھی۔ . . . .

اس نے اپنے ماضی پر غور کرنا شروع کیا۔ اسے اب سے پانچ برس پہلے کا زمانہ یاد آیا جب وہ اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ کتنا خوش تھا۔ علم کو ایک انمول نعمت سمجھ کر اس طرح جذب کر رہا تھا جس طرح ریت پانی کو جذب کر لیتی ہے۔ سب استاد اس کے علمی شوق اور اس کی غور و فکر کی عادت کے معترف تھے اور کہا کرتے اگر مطالعہ جاری رکھا تو ایک دن بڑا مفکر بن جائے گا۔ مگر اس کے انٹرنس پاس کرنے کی دیر تھی کہ وہ آزادی وہ علمی ولولے خواب و خیال ہو گئے۔ اس کے باپ کو عیاشیوں اور بے اعتدالیوں نے قبل از وقت ضعیف کر دیا تھا اور وہ وقت آ پہنچا تھا کہ اسے روزی کمانے کے لیے باپ کی جگہ لینی پڑی۔

تلاشِ معاش کی تگ و دو میں اسے کیسے کیسے سنگدل انسانوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ کن کن دفتروں سے ناکام اور بے عزت ہو کر نکلنا پڑا تھا۔ ذلت کے بے شمار دن، فکر اور پریشانی کی بے شمار راتیں گزارنے کے بعد آخر ایک نیم سرکاری دفتر میں اسے سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی جہاں وہ صبح سے شام تک گدھے کی طرح کام کرتا تھا مگر جہاں اسے گدھے سے آدھی اجرت بھی نہیں ملتی تھی۔

اور پھر یہ اس کا زہد و اتقا جس نے اس کی زندگی کو اور بھی خشک اور بے رنگ بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نے یہ پارسائی کی زندگی کیوں اختیار کی۔ اس کے باپ دادا میں کوئی شخص متقی و پرہیزگار نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی ایسا نیک سیرت رفیق یا رہنما بھی نہ ملا تھا جس کی پاک زندگی اس پر اپنا پرتو ڈالتی۔ اس نے کچھ ایسی دینی کتابیں بھی نہ پڑھی تھیں جو اس کے خیالات کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتیں۔ اس کے باوجود وہ پاکباز تھا اور حتی المقدور دینی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرتا تھا آخر پھر وہ ایسا کیوں تھا؟ اس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے بچپن میں اپنے باپ کے طفیل لہو و لعب، مے خواری و بدکاری کے ایسے گھناؤنے منظر دیکھے تھے کہ اس کے ننھے سے معصوم دل میں ہمیشہ کے لیے ان چیزوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی اور اسے اپنے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت نظر آئی تھی —— مذہب!

نوجوان نے سوچنا شروع کیا "اگر شراب کی یہ بوتل ان لوگوں کو مل جاتی تو وہ کس قدر خوش ہو جاتے۔ وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے پاس رہ سکتے۔ عورت کی آواز میں کتنا سوز تھا۔ اسے واقعی سردی لگ رہی تھی۔ مرد نے کہا تھا کہ صرف چند گھونٹ اسے گرما سکتے ہیں۔ . . . کیا شراب سے سردی دور ہو جاتی ہے؟" کمبل سرک گیا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر اپنے جسم کو پھر کمبل میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔

اچانک نوجوان کے ذہن میں ایک پرانا سوال تازہ ہو گیا جو اسے کئی بار پریشان کر چکا تھا۔ وہ یہ کہ آخر اس شراب میں کیا جادو ہے کہ جو ایک بار اس کو منہ لگا لیتا ہے اسی کا غلام بن جاتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اسے برا کہتے ہیں۔ بڑے بڑے حکما اور دانا اس کی مضرتوں پہ ضخیم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود کروڑوں انسان ہر

روزانہ پیتے ہیں ــــــ شاہ وگدا، بوڑھے اور جوان، عورت اور مرد۔

مزدور دن بھر کڑی محنت جھیلتا ہے اور شام کو مزدوری کے چھ آنے میں سے چار آنے اس کی نذر کر دیتا ہے۔ بعض فقیروں کو دیکھا کہ دن بھر ہزاروں صلواتیں اور جھڑکیاں سن کر انہوں نے تھوڑے سے پیسے جمع کیے اور رات کو بھوکے رہ کر سب کے سب شراب میں اڑا دیتے۔

آخر یہ کیا چیز ہے جس کو دنیا بُرا جانتی ہے مگر چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ آرٹ، ادب اور فنونِ لطیفہ کوئی بھی اس کے اثر سے خالی نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانے کے شعراء کے دواوین اس کی مدح سرائیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ گو ان کی زبانیں مختلف ہیں مگر ان سب کی روح میں اسی کی تشنگی ہے۔ اگر ان کے کلام میں سے شراب و ساقی، ساغر و مینا کا ذکر نکال دیا جائے تو ساری دنیا کی شاعری کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کی تعریف میں بھی لطف ہے اور مذمت میں بھی۔ اور تو اور دینی کتابوں تک میں اس کا جا بجا ذکر موجود ہے۔

اور ــــــ اور پھر کیا خود فطرت ہر آن اس کے پینے کی ترغیب نہیں دیتی؟ اگر نہیں تو لالہ کے پھول اس وضع کے کیوں بنائے کہ وہ مے کی گلابیاں معلوم ہوں؟ پھلوں میں رس کیوں پیدا کیا؟ نرگس میں کیفیت اور نکہت کیوں بھر دی؟ بلبل کا نغمہ مستی بھرا کیوں ہے؟

یہ پہاڑوں کی برفیلی چوٹیاں، یہ نیلی نیلی سی ملگجی چاندنی، یہ طلوع و غروبِ آفتاب کے نظارے آخر یہ سب چیزیں کیوں پیدا کی گئیں جنہیں دیکھ کر اسی قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے جیسا نشہ پی کر؟

. . . . . اور پھر اس کے باپ کو دیکھو، دنیا میں سب سے زیادہ جس چیز سے اسے الفت ہے۔ وہ بھی اس کا بیٹا ہے۔ مگر یہ شراب اسے اس سے بھی برگشتہ کیے دیتی ہے۔

ہر چند اس کا جگر خراب ہو چکا ہے اور اس کا ایک ایک قطرہ اس کے لیے سم قاتل ہے پھر بھی وہ اس کے لیے مضطرب ہے۔ گویا اس کے مقابلے میں جان کی کچھ اصل و حقیقت نہیں۔ کیا واقعی اس میں کوئی ایسی لذت یا کیف و سرمستی ہے جس کا مول انسان کی زندگی بھی نہیں دے سکتی . . . . .

یکایک ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا آیا اور نوجوان کا جسم کپکپا اٹھا۔ اس وقت آس پاس کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ بس وہ تھا اور ایک ٹھٹھرا ہوا چاند جو کناٹ پلیس کی رفیع الشان عمارتوں پر خنک چاندنی ڈال رہا تھا۔ ہوا جسم کے ننگے حصوں پر کند چھریوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ درختوں کے پتے آپس میں اس طرح بج رہے تھے جیسے کسی سردی سے کانپتے ہوئے آدمی کے دانت۔ پل بھر کے لیے دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ کسی تانگے والے کے گانے کی آواز آئی اور پھر رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔

چاند کی کچھ کرنیں درخت کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر بنچ پر پڑ رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں نوجوان نے بوتل کی طرف دیکھا تو اسے سرخ سرخ شے میں سے ایک لپٹ سی نکلتی ہوئی معلوم ہوئی ـــــ جس طرح انگیٹھی کے دہکتے ہوتے کوئلوں سے نکلتی ہے۔

کیا اس خطرناک چیز کو جوں کا توں گھر لے جانا ہوگا؟ کیا اسے ٹھکانے لگانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟

رات کے کوئی ڈھائی بجے ہوں گے کہ نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا۔ اور بے تحاشا کواڑ کھٹکھٹانے لگا۔ باپ انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کون ؟"

"میں ـــ" ایک بھدی سی آواز میں، جو انسان سے زیادہ حیوان کی آواز سے ملتی جلتی تھی، نوجوان نے جواب دیا۔

دروازہ کھلا تو باپ کی نظر بیٹے کے خالی ہاتھوں پر پڑی۔

"بیچ آئے ؟"

"اونہہ۔" اور نوجوان نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔

"کیا ہوئی پھر ؟"

"یہ رہی . . . . . یہ . . . . . یہ . . . . . یہ !"

بڈھے کا منہ کھلے کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء

سمجھوتہ

پہلے پہل جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور ایسی اَن ہونی سی بات! کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب بار بار اس کے کمرے میں جا کر اس کی چیزوں کو گم پایا۔ یہاں تک کہ اس کا بچپن کا فوٹو تک، جس میں وہ ایک کبوتر کو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہی تھی، اس کی سنگھار میز پر سے غائب تھا تو شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔

کئی دن تک وہ گم سم رہا۔ نہ کہیں گیا نہ نوکروں پر یہ بات ظاہر ہونے دی، نہ کسی رشتہ دار یا دوست سے اس کا ذکر کیا۔ مگر رفتہ رفتہ جب بدنامی کا خوف دل سے نکل گیا اور ادھر اس کے لوٹ آنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی تو اس نے ٹھنڈے دل سے اس واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ ایک خیال بار بار اسے کچوکے دینے لگا:

"میں نے اس عورت کو سچے دل سے چاہا، ہر طرح اس کے ناز اٹھائے۔ اس کی وہ کونسی خواہش تھی جسے میں نے پورا نہ کیا۔ اور اس کا اس نے یہ صلہ دیا کہ ایک دن چپکے سے، بغیر کوئی وجہ بتائے، بغیر ایک پیغام تک چھوڑے بھاگ گئی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے آنے والے برسوں کی تنہائیوں کا تصور کیا اور اس کی رُوح کپکپا کر رہ گئی۔

وہ نوعمری ہی سے ان تنہائیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا جو اپنی حیثیت کے مطابق معمولی سا لکھا پڑھا کر سدھار گئے تھے۔ غربت اور بے کسی

کے زمانے میں اسے کسی سے ملنے جلنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے تنہائی ہی میں اماں سمجھی۔ شباب کا بیشتر زمانہ فکرِ معاش کی جد و جہد کی نذر ہوگیا۔ آخر جب اس کے دن پھرے اور وہ بھی کوئی چیز سمجھا جانے لگا تو وہ اپنی گوشہ نشینی کی زندگی کا اس قدر عادی ہوچکا تھا کہ کسی قیمت اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے رشتہ دار جو اس کی حالت کے سدھرتے ہی آپ سے آپ پیدا ہوگئے تھے۔ اس کی تنہائی میں مزاحم ہونے شروع ہوئے۔

"بھئی تو کیا عمر بھر کنوارے ہی رہو گے؟" وہ آئے دن آآکر اس سے اس سے کہا کرتے: "تم مانو چاہے نہ مانو ہم تو چاند سی دلہن لا کے ہی رہیں گے۔"

ایک بزرگ جو رشتہ میں دُور کے ماموں ہوتے تھے، کہتے:

"اماں دور کیوں جاؤ۔ اپنے خاندان ہی میں جو ماشاء اللہ ایک سے ایک حسین و جمیل لڑکی موجود ہے۔"

ہر بار اس کا انکار پہلے سے کمزور ہوتا گیا۔ اور ایک دن برادری ہی کی ایک قبول صورت تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کردی گئی۔

طالب علمی کے زمانے میں اس کے ساتھی اکثر تعطیلات میں تین تین چار چار کی ٹولیاں بنا کر "تفریح" کی تلاش میں آس پاس کے قصبوں اور گاؤں میں نکل جایا کرتے۔ وہ ان سے دور ہی دور رہتا اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کیا کرتا۔ مگر اب عورت اور اس کی ہم جلیسی کی لذتوں سے واقف ہو کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ اب تک کیسی رائیگاں اور بے معنی زندگی گزارتا رہا ہے۔

شادی کے بعد اُس کی شوہرانہ فرض شناسی ضرب المثل بن گئی تھی۔ بیوی کی محبت نے اس پر ایسا قابو پالیا کہ وہ باقی ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا۔ وہ بیوی سے الگ کسی پارٹی

یا دعوت میں شریک نہ ہوتا نہ تنہا کسی سے ملتا جلتا۔ بیوی سے جدا رہنا اس پر اتنا شاق گزرتا کہ دفتر میں وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ بار بار گھڑی پر نظر پڑتی کہ کب وقت پورا ہو تو وہ گھر کی راہ لے۔

دفتر سے آتے وقت کبھی راستے میں بچپن کا کوئی بے تکلف رنگین مزاج دوست مل جاتا اور اسے اپنے ساتھ کسی محفل نشاط میں لے جانا چاہتا تو بڑی سرد مہری سے جواب دیتا:

"نا صاحب! مجھے تو معاف ہی رکھیئے۔ میرا یہ وقت میری بیوی کا ہے جو دن بھر میری آس لگائے گھر میں تنہا بیٹھی رہی ہے۔" کبھی کہتا: "میں کسی ایسی محفل میں شامل نہیں ہو سکتا جس میں میری بیوی نہ جا سکتی ہو!"

"اور یہ سب اس بے وفا عورت کے لیے!" اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا: "جس کی محبت محض ایک فریب تھی۔"

یک لخت اس کے دل میں اپنی بیوی کے خلاف اس قدر نفرت اور غصہ بھر گیا کہ اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ خیال ہی خیال میں اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اپنی بیوی کا گلا دبا رکھا ہے۔ اس کی وحشت زدہ آنکھیں رحم اور عفو کی ملتجی ہیں۔ مگر اس بے وفا عورت کے لیے اس کے دل میں کوئی رحم نہیں۔ وہ اس کا گلا دبا رہا ہے۔ زور سے اور زور سے یہاں تک کہ اس کا سرخ و سفید کتابی چہرہ سیاہ پڑ گیا اور اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں خون کے دو گھناؤنے لوتھڑے بن کر باہر نکل آئیں . . . . اور اس نے اس کے بے جان جسم کو زمین پر پٹخ دیا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے۔ انتقام کا یہ تند و تیز جذبہ، یہ جنونی خروش دھیما پڑتا اور ایک استہزا کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا عشق، ایثار و خلوص،

بیوی کی بے وفائی اور اس پر اپنا غیظ و غضب یہ سب باتیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگیں۔ اور ایک دن اسے اپنی حالت پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا:

"میں بھی کیسا بے وقوف ہوں کہ ایک عورت کو اس قدر اہمیت دیتا رہا۔ عورت کے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہی حماقت ہے۔ اس کی مثال بالکل بچے کی سی ہے۔ جب تک اسے کھلونوں سے بہلایا جا سکتا ہے بہلانا چاہیے۔ مگر جب وہ نہ مانے اور رونا اور مچلنا شروع کر دے تو بہتر یہی ہے کہ اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دیا جائے۔ رہا عشق اور وفا کا معاملہ تو یہ سراسر ڈھکوسلا ہے۔"

ایک دن وہ دفتر سے آ رہا تھا تو بچپن کا وہی رنگین مزاج دوست جو اسے عیش و نشاط کی ترغیبیں دیا کرتا تھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ قصد کیا کہ کترا کے نکل جائے مگر دوست کی نظر پڑ چکی تھی۔ ناچار رکنا پڑا۔ دوست کو اس کی بیوی کے بھاگ جانے کا علم نہ تھا حسبِ عادت مسکرا کر کہنے لگا:

"آج تو بھابی جان چاہے جو کہیں میں تمہیں ساتھ لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

وہ خاصی دیر تک خاموش کھڑا اس کا منہ تکتا رہا۔ پھر ایک لطیف سی مسکراہٹ نے اس کی سنجیدگی کو توڑ دیا اور وہ کہہ اٹھا:

"اچھا چلو۔ کہاں چلنا ہے؟"

دوست بھونچکا رہ گیا۔

جب تک رات کا اندھیرا اچھی طرح نہ پھیل گیا دونوں وقت گزارنے کے لیے ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اس کے بعد دوست اسے لے کر ایک حسن فروش کے کوٹھے پر پہنچا۔ زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ کچھ خوف، کچھ جھجک، کچھ ندامت، کچھ یہ خلش دل میں تھی کہ جو زندگی ابھی تک اس قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف تھی اب اس پر

سیاہ کاری کے دھبے پڑ جائیں گے۔ اور یہ محض اس بے وفا عورت کی بدولت ۔۔ مگر یہ ذہنی الجھن زیادہ دیر نہ رہی۔ شراب کا دَور چلنا تھا کہ یک لخت سارے حجاب جیسے اٹھ سے گئے۔ وہ ہنس ہنس کر گانے والی کو داد دینے اور فقرے کسنے لگا۔ اور گھنٹے ہی بھر میں پورا تماش بین بن گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پہلے پہل اسے اس کوچے میں جانے کے لیے دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر چند ہی روز بعد دوست اسے اپنی راہ میں حائل ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ وہ اکیلا ہی شب گردی کے لیے نکلنے لگا۔ پہلے گھوم پھر کر ساری منڈی کا جائزہ لیتا، مال کو پرکھتا اور پھر اپنا پسند کیا ہوا دانہ ایک شوقین مزاج رئیس زادے کی طرح منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ دفتر سے اٹھ کر شاذ ہی کبھی گھر پہنچتا۔ آج اس کوٹھے پر ہے تو کل اس بالاخانے پر۔ جھوٹی محبتیں جتاتا اور خود بھی جھوٹی محبتوں سے لطف اٹھاتا۔ اگلے روز یہ باتیں خواب کی طرح معلوم ہوتیں۔ نئی رات آتی تو نئے سرے سے حسن و عشق کی دنیا بسانے کی دھن پھر سوار ہو جاتی۔ اس نے اپنا یہ اصول بنا لیا تھا کہ عورت سے تعلق محض وقتی اور کاروباری ہونا چاہیے۔ اور دوسرے سودوں کی طرح اس میں بھی ہر طرح کا دروغ جائز ہے۔

اسے دفتر سے جو مشاہرہ ملتا تھا وہ اتنا تھا کہ اس میں ایک کنبہ دار شخص آسودگی اور عزت کے ساتھ بسر کر سکے، مگر نہ اتنا کہ اس میں کسی مستقل اندھادھند فضول خرچی کی گنجائش ہو۔ شادی سے پہلے جب اس کے اخراجات برائے نام تھے اس نے اچھی خاصی پونجی جمع کر لی تھی۔ شادی کے بعد بیوی کے لیے گراں قدر تحائف خریدنے پر بھی اس رقم میں کچھ زیادہ کمی نہ ہوئی تھی۔ مگر اب جبکہ روز روز بڑی بڑی رقموں کے چیک

کاٹے جانے لگے تو چند ہی ہفتوں میں دیوالہ نکلتا نظر آنے لگا۔ کچھ تو اس ڈر سے کہ کہیں بالکل ہی مفلس نہ ہو جائے اور پھر اس کوچے میں جانے کے لیے ترسے، اور کچھ مسلسل راتوں کے جاگنے سے صحت کے گر جانے کے باعث اس کی اوباشیوں میں جلد ہی کمی ہو گئی۔ یعنی جہاں پہلے مہینے میں مشکل سے دو چار ناغے ہوتے تھے وہاں اب ہفتے میں تین تین چار چار ناغے ہونے لگے۔

ایک دن صبح کو جب وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو کسی نے آہستہ سے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ؟"

کوئی جواب نہ پا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا اور ٹھٹک کر رہ گیا —— اس کی مغرور بیوی سودائیوں کا سا حال بنائے، سر جھکائے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے، بال الجھے ہوئے تھے، چہرہ زرد اور آنکھوں میں گڑھے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر معاً اسے ایسا گمان ہوا جیسے کوئی کتیا کیچڑ میں دوسرے کتوں کے ساتھ لوٹ لگا کر آئی ہو۔

وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی رہی پھر اچانک اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے اپنی ٹانگوں کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔

"مجھے بخش دو۔ مجھے بخش دو" اس کی بیوی نے سسکیاں لے لے کے کہنا شروع کیا "میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے سخت نفرت کرتے ہو گے۔ میری صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہو گے۔ مگر میں تم سے محبت نہیں مانگتی۔ نہ اس کی توقع کر سکتی ہوں۔ آہ! میں اس لائق ہی نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے صرف

اپنے گھر میں پناہ دو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ آہ! میں اندھی ہو گئی تھی۔ مجھے بخش دو۔ مجھ سے سخت فریب کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے خلاف غیظ و غضب کی جو آگ شروع شروع میں اس کے دل میں بھڑکی تھی کچھ تو وقت نے اور کچھ اس کے نئے مشاغل نے اسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اور اگر کچھ رہا سہا غصہ تھا بھی تو وہ اب اس کی یہ مصیبت زدہ حالت دیکھ کر جاتا رہا تھا۔ اسے اس کی حالت پر رحم نہیں آیا بلکہ کراہت سی محسوس ہوئی۔

جب سے وہ بھاگی تھی اس کے دل میں رہ رہ کے یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ کونسا خوش نصیب تھا جس کی محبت پر اسے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ممکن ہے وہ اس کے دوستوں میں سے کوئی ہو یا ممکن ہے کوئی اجنبی ہو۔ مگر اب اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل میں اس قسم کا کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا۔ وہ اس سارے معاملے سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا کہ چاہتا تھا جلد سے جلد اس عورت سے اپنا پیچھا چھڑا لے۔ وہ کہے جا رہی تھی:

"تمہاری شرافت اور نیک دلی پر پورا یقین ہے کہ تم مجھے گھر سے نہیں نکالو گے۔ دنیا میں اس گھر کے سوا میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اس گھر سے نکل کر میں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم بے شک مجھ سے نوکرانیوں کا سا برتاؤ کرنا۔ آہ! میں اسی قابل ہوں۔"

"اس قدر زور سے نہ چلاؤ۔ نوکر سن رہے ہوں گے۔"

دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے اصرار کے ساتھ مگر بغیر کسی درشتی کے اپنے پاؤں چھڑا لیے، ٹوپی ہاتھ میں تھامی اور گھر سے نکل گیا۔

دفتر میں رہ رہ کے بیوی کی یہ حالت زار اس کی نظروں میں پھرتی رہی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی کم سن الھڑ حسینہ تھی جس کا وہ چھ مہینے پہلے شیدائی تھا۔

کیا یہ وہی نازنین تھی جسے خوشبوؤں سے عشق تھا۔ جو اپنے جسم پر گرد کا ایک ذرہ بھی نہ سہہ سکتی تھی اور جس کے ساتھ باغ کی کسی روش پر ٹہلتے ہوئے اس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔

"اگر وہ میرے ہاں رہنے ہی پر مصر ہے۔" اس نے دل میں کہا "تو یوں ہی سہی میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ اسے روٹی کپڑے سے بھی جواب دے دوں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ میں اس سے اب کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ میری بے اعتنائیوں سے کڑھ کڑھ کر یا ضمیر کی ملامتیں سہہ سہہ کر جلد ہی پھر بھاگ جائے گی۔"

اس کی بیوی کو واپس آئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ تو اس نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا تھا اور نہ کوئی بات ہی کی تھی۔ جیسے وہ گھر میں تھی ہی نہیں۔ ادھر اس کی بیوی بھی اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہی تھی۔ البتہ اس کی موجودگی مختلف صورتوں میں اپنی یاد دلاتی رہی۔

جب وہ سو کر اٹھتا تو اس کی نظر اپنے سرہانے کے پاس تپائی پر رکھے ہوئے گلدان پر پڑتی جس میں تازہ اور خوبصورت پھول سلیقے اور ہنرمندی سے سجے ہوتے۔

ابھی وہ بستر پر لیٹا اخبار ہی پڑھ رہا ہوتا کہ چھوکرا چائے لے کر آجاتا۔ ٹوسٹ نفاست سے کٹے اور سکے ہوتے۔ خوش ذائقہ چائے جیسی شادی کے ابتدائی دنوں میں لے ملا کرتی تھی۔ وہ غسل خانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں جاتا تو اسے نیا جوڑا کیل کانٹے سے لیس ملتا، قمیص یا سوٹ کی مناسبت سے نکٹائی اور رومال، کفوں میں اسٹڈ لگے ہوئے، بوٹ پر پالش کیا ہوا۔ دوپہر کو چپڑاسی گھر سے کھانا لے کر جاتا تو اس کی من بھاتی سبزیاں ایسی مزے کی پکی ہوتیں کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوتی اور وہ دل میں کہتا:

"یہ ساری خاطر داریاں مجھے دوبارہ رام کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں لیکن بندہ اُب ان چکموں میں نہیں آئے گا۔"

وہ اکثر سرِ شام گھر سے نکل جاتا اور رات کے ایک دو بجے سے پہلے شاذ ہی لوٹتا۔ کبھی ساری رات ہی غائب رہتا۔ مگر اس سے کوئی بازپرس نہ کی جاتی۔ نہ اس کی آسائشوں میں کوئی کمی آنے پاتی۔

دھیرے دھیرے اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔

ایک دن برسات میں جب ابر چھایا ہوا تھا اور ٹھنڈی متوالی ہوائیں چل رہی تھیں اس نے دفتر میں ایک بڑی رقم کا چیک کاٹ کر چپراسی کو دیا اور بینا بی سے وقت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں وہ کسی رات بھی گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ کچھ تو دفتر میں شام کو دیر دیر تک بیٹھا رہنا پڑا تھا کچھ تکان، کچھ سستی، کچھ ایسے ہی دل نہ چاہا تھا۔ مگر آج ارادہ تھا کہ ان سب دنوں کی کسر ایک ہی بار نکال دے۔

تھوڑی دیر میں چپراسی خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ اس کا چیک لوٹا دیا گیا تھا کیونکہ اس کے حساب میں چند روپے اور آنے پائی کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ اس انجام سے بے خبر نہیں تھا۔ مگر اس کا تو اسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ دن اس قدر جلد آ جائے گا۔ اس نے سوچا کہیں سے قرض لینا چاہیے۔ چنانچہ جھجکتے جھجکتے ٹیلی فون پر دو ایک بے تکلف دوستوں سے اپنی غرض بیان کی۔ مگر مہینہ ختم ہونے کو تھا، ان دنوں اتنا روپیہ کس کے پاس ہوتا!

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے بکس میں ایک سونے کی انگوٹھی پڑی ہے جس میں ایک بیش قیمت نگینہ جڑا ہوا ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی بیوی نے اچھے خاصے داموں اس کے لیے لی تھی۔ جب اس عورت سے اس کا قلبی رشتہ ہی ٹوٹ چکا ہے تو پھر وہ اس کی یادگار کو اپنے پاس کیوں رکھے!

شوق کی آگ جو چند لمحے پہلے دھیمی پڑ گئی تھی یک لخت پھر سلگ اٹھی۔ اس نے سوچا مجھے انگوٹھی لے کر شام سے پہلے پہلے جوہریوں کے ہاں پہنچ جانا چاہیے۔

تیسرے پہر جس وقت وہ بکس سے انگوٹھی نکال کر گھر کے صحن میں سے گزر رہا تھا تو ایک خاتون بنفشی ساری میں ملبوس فضاؤں کو مہکاتی ہوئی اچانک اس کے پاس سے گزر گئی۔ خاتون نے اس کی طرف نہیں دیکھا مگر اس نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی، جو ہر چند بہت مختصر تھی مگر اس کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھی۔

یہ خاتون اس کی وہی مفرور بیوی تھی جس کے متعلق تین مہینے پہلے اسے گمان ہوا تھا کہ قبر میں سے نکل کے آئی ہے۔ دونوں وقت عمدہ عمدہ غذائیں کھانے، بڑھیا بڑھیا صابن، کریم اور غازے استعمال کرنے سے اس کا رنگ روپ پھر نکل آیا تھا۔ گال پھر بھرے بھرے سے ہو گئے تھے اور آنکھیں زندگی کے نور سے چمکنے لگی تھیں۔ اس کے حسن و شباب کا وہی عالم تھا جس کی جھلک اس نے شادی کی پہلی رات دیکھی تھی — فرق تھا تو صرف اس قدر کہ پہلے اس کے چہرے پر معصومیت برستی تھی مگر اب اس کی جگہ ایک لطیف متانت، ایک دلآویز پشیمانی جھلکنے لگی تھی۔

ابھی دن ہی تھا کہ وہ شہر کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں جوہریوں کی دکانیں تھیں۔ اس وقت وہاں لین دین کا بازار خوب گرم تھا۔ کوئی دکان ایسی نہ تھی جس میں گاہکوں کا جمگھٹ نہ ہو۔ اسے پہلے کبھی کوئی چیز بیچنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ دکاندار کے پاس

جانے ہی سے ہچکچا رہا تھا۔ یہ بھیڑ دیکھی تو اور بھی گھبرا گیا۔ اتنے آدمیوں کی موجودگی میں بھلا انگوٹھی کی بات چیت کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ نہ جانے کیا خیال کریں گے۔

وہ کوئی گھنٹہ بھر تک اس بازار میں گھومتا رہا۔ اگر کسی دکان سے دو ایک خریدار چلے جاتے تو دو چار نئے آ جاتے اور بھیڑ جوں کی توں رہتی۔ آخر ایک جوہری کی دکان میں اسے نسبتاً کم آدمی دکھائی دیے اور وہ ہمت کرکے اس میں گھس گیا۔

"فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟" جوہری نے پوچھا۔

"میں ــــ میں ذرا بندے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ذرا سی دیر میں جوہری نے بندوں کے ڈبوں کے ڈھیر لگا دیے۔

"اس جوڑی کی کیا قیمت ہے؟" آخر اس نے ایک جوڑی کو پسند کرتے ہوئے پوچھا:

"پینسٹھ روپے!"

"بس یہ ٹھیک ہے۔ لیکن معاف کیجیے! میں روپیہ ساتھ لانا بھول گیا۔ آپ انہیں علٰحدہ رکھ دیجیے۔ میں کل لے جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔" جوہری نے بندوں کے ڈبوں کو سمیٹتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

دکان سے نکل کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

اس وقت اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا، آج تو اس پروگرام کو منسوخ ہی کر دینا چاہیے۔ کل میں کسی ملازم کو انگوٹھی دے کر بھیجوں گا۔ یا ممکن ہے کل اس کی نوبت ہی نہ آئے اور کہیں سے روپے کا انتظام ہو جائے۔

ہر چند اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی اور وہ چلتے چلتے تھک بھی گیا تھا مگر وہ افسردہ خاطر نہیں تھا۔ بلکہ اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی چونچالی تھی۔ یہاں سے بازارِ حسن قریب ہی تھا گھر لوٹتے وقت جی میں آئی لگے ہاتھوں اس کوچے کی سیر بھی کرتے چلیں۔ پاس سے نہیں تو دور ہی سے ذرا رنگ ڈھنگ دیکھ آئیں۔

وہ بازار حسبِ معمول آج بھی خوب جگمگا رہا تھا۔ بیسوائیں بڑے ٹھسّے سے اپنے اپنے بالاخانے کے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں اور لوگ تھے کہ پروانوں کی طرح روشنیوں کی طرف امنڈے پڑتے تھے۔ بعض کمروں کے دریچوں سے ہلکی ہلکی نیلی خنک روشنی نکل رہی تھی۔ بعض گھروں سے شور وغل اور قہقہے جن کے بیچ بیچ میں سارنگی کے تار ہلکے ہلکے جھنجھنا اٹھتے تھے۔

وہ سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا۔ ایک ایک مکان کے سامنے سے گزرتا اور مکان والی کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض بیسواؤں کو وہ جانتا تھا اور بعض کے ہاں اس کا آنا جانا بھی تھا۔ مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے قدم بار بار تیز اٹھنے لگتے تھے۔

جب وہ اس بازار کے ختم پر پہنچا تو اچانک اسے اپنی بیوی کی یاد آئی اور اس کی بنفشی ساری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ذہن غیر ارادی طور پر اس کا ان عورتوں سے موازنہ کرنے لگا۔

اب تک اس نے جتنی عورتوں کو دیکھا تھا ان کی کیفیت ناٹک کی ہیروئنوں کی سی تھی کہ انہیں جتنی دور سے دیکھا جائے وہ اتنی ہی زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس کے برعکس اس کی بیوی کا حسن بُعد و قرب کی تفریق سے بے نیاز تھا۔ نہ ان کے خط و خال میں اس کی سی دل کشی تھی اور نہ عادات و اطوار میں وہ نفاست جو ایک

متمدن اور تعلیم یافتہ خاتون میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان میں سے بعض کو تو سنگھار کرنا بھی نہ آتا تھا کسی نے چہرے پر پوڈر لیپ رکھا تھا تو کسی نے ترچھی مانگ نکال رکھی تھی۔ بالوں میں درجنوں ہیئر پنیں اور کلپ لگے ہوئے تھے جیسے کسی کل میں بہت سے پرزے لگے ہوں۔ یہ سچ تھا کہ بعض صورتیں اچھی بھی تھیں مگر نہ تو انہیں لباس کا کوئی سلیقہ تھا اور نہ انہوں نے رنگوں کے انتخاب میں کوئی توازن ملحوظ رکھا تھا بس بھڑک ہی بھڑک تھی یا رنگوں کی گھما گھمی۔ بعض تو بالکل گنوارنوں کی طرح زیوروں سے لدی پھندی تھیں۔ سادگی جو آرائش کی جان ہے اس سے وہ کوسوں دُور تھیں۔

وہ گھر کی طرف چلا تو بیوی کی تصویر بدستور اس کے ذہن میں قائم تھی۔ خیال ہی خیال میں شادی کا ابتدائی زمانہ اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔ وہ بھی کیسا وقت تھا جب تاہل زندگی کی مسرتیں پہلی مرتبہ اس پر عیاں ہوئی تھیں اور اس کی رُوح انتہائے لذت سے کانپ اٹھی تھی۔ وہ راتوں کی طویل گھڑیوں کا آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دینا۔ وہ عیش و سرخوشی کے دن، وہ کیف و سرمستی کی راتیں۔ پھر لطف یہ کہ یہ بے حساب خنایات قریب قریب بن داموں تھیں۔ جوں جوں گھر قریب آتا گیا اس کے قدم آپ ہی آپ تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ آخر جب وہ گھر کے سامنے پہنچا تو ایک استہزا آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر جھلکنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں کہا:

"یہ سچ سہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کونسی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش گیا اور جن سے ملنے کے لیے میں آج بھی تڑپتا رہا ہوں"

وہ اوپر کی منزل میں تن تنہا کھلے آسمان کے نیچے چھپر کٹ پر خوشبوؤں میں بسی ہوئی کچھ سو رہی، کچھ جاگ رہی تھی کہ اچانک کھڑکا سن کر چونک اٹھی۔ کان آہٹ پر لگا دیے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر سہج سہج قدم دھرتا اس کے پاس آ رہا ہو۔

سنہ ۱۹۴۳ء

سیاہ و سفید

جی۔اے۔ دی۔ مڈل اسکول کی استانی میمونہ بیگم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہی تھی کہ پچھلے کئی برس میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے دو دو تین تین روپے بچا کر جو سو روپیہ جمع کر لیا تھا اس کا کون سا زیور بناؤں کہ اچانک اسے اپنی بائیں پیشانی کے قریب ایک لٹ میں ایک سفید بال نظر آیا اور اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اس نے جلد ہی آئینے کی مدد سے اس بال کو لٹ سے الگ کر لیا اور کھینچ کر نکال ڈالا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اب تک وہ ایسے کتنے سفید بال یوں ہی کھینچ کھینچ کر نکال چکی تھی۔ البتہ اس احساس نے کہ وہ روز بروز بوڑھی ہوتی جا رہی ہے پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔

اس کا باپ ایک غریب مدرس تھا جس نے مرنے سے پہلے اپنی بے ماں کی بیٹیوں کو گھر ہی پر پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ نوشت و خواند کے ذریعے اپنا پیٹ پال سکیں۔ بڑی بیٹی ساجدہ کو جو نسبتاً قبول صورت تھی زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اس کے باپ کے ایک دور کے رشتہ دار نے جو دارالسلطنت دہلی کے ایک دفتر میں عہدہ دار تھا کچھ تو رشتہ داری کے خیال سے، کچھ نیکی کا کام سمجھ کر، اور کچھ یہ کہ اس نے لڑکی کی خوش جمالی کی تعریف سن رکھی تھی اپنے بیٹے کی شادی اس سے کر دی۔ بڑی کا بیٹی کی طرف سے مطمئن ہو کر بوڑھے مدرس کو چھوٹی بیٹی کی فکر

ہوئی۔ مگر اس کی شادی کا بندوبست ہونے سے پہلے ہی وہ چل بسا غنیمت یہ ہوا کہ مرنے سے تھوڑے ہی دن پہلے اس کی پرانی خدمات اور اثر ورسوخ کے طفیل میمونہ کو پینتیس روپے ماہوار پر لاہور کے قریب ایک قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی۔

باپ کے مرنے کے بعد میمونہ اسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس اٹھ آئی۔ وہ دن بھر اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی اور جب چھٹی ہوتی تو بورڈنگ ہاؤس میں آجاتی۔ شروع شروع میں اسے یہ کام مشکل بھی معلوم ہوا اور دلچسپ بھی۔ مگر دو ہی سال میں وہ اس سے بیزار ہو گئی۔ دن بھر ناسمجھ اور چنچل لڑکیوں کے ساتھ مغز مارنے کے سوا اور اس میں رکھا ہی کیا تھا۔

کبھی کبھی شام کو وہ دوسری استانیوں کے ساتھ اسکول سے باہر چہل قدمی کرنے بھی جاتی۔ مگر اس سے اسے کوئی لطف حاصل نہ ہوتا۔ بھلا قصبے میں اس کی دلچسپی کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ مرد اکھڑ اور ان پڑھ۔ عورتیں میلی کچیلی اور زبان دراز۔ سڑکیں کچی اور گرد آلود۔ اور مکان مٹی کے بنے ہوتے بے ڈھنگے بے ڈھنگے۔ بعض دفعہ کسی امیر زمیندار کی ماں اسے اور دوسری استانیوں کو کھانے پر بلا لیتی۔ یا کبھی کبھار دو چار استانیاں مل کر کپڑا وغیرہ خریدنے شہر چلی جاتیں۔ اس کے سوا اس کھلے بندی خانے سے نکلنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس بے رنگ زندگی سے سخت دل برداشتہ ہو جاتی۔ مگر پھر سوچتی، ابھی عمر پڑی ہے، کیا پتہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے . . . . . اسی طرح دس سال بیت گئے تھے۔

صبح کے واقعہ نے میمونہ کے دماغ کو دن بھر پریشان رکھا۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کو بات بات پر جھڑکتی رہی۔ کئی لفظوں کے معنی بھی وہ ٹھیک طور پر نہ سمجھا سکی۔ بورڈنگ ہاؤس میں آکر بھی اس کا جی کسی کام میں نہ لگا۔ وہ سرِ شام ہی سے آکر بستر پر لیٹ گئی۔

اور اپنی حالت پر غور کرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی جوانی کے ڈھلنے کی یہ وجہ ہے کہ اسے اپنی زندگی سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی تفریح کا کوئی سامان نہیں۔ اسے کسی سے اُنس نہیں، لگاؤ نہیں۔ دن بھر وہ بچی اور لڑکیوں کا شور جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی کیونکہ اس سے اکثر اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا،

بڑے دنوں کی چھٹیوں سے کوئی آٹھ روز پہلے اسے ساجدہ کا خط ملا۔ یہ خط کئی سال کے بعد آیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بہن آجکل کہاں ہے۔ ساجدہ نے لکھا تھا کہ اس کے میاں کا تبادلہ دہلی ہو گیا ہے۔ وہ نئی دہلی کے ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ اس نے دہلی کی قدیم و جدید عمارتوں، سیر گاہوں۔ نئی دہلی کے کھیل تماشوں، پُرفضا پارکوں، سرکاری بینڈ، دکانوں اور ہوٹلوں کی گہما گہمی اور دوسری دلچسپیوں کا حال ایسی خوبی سے لکھا تھا کہ ناول کا سماں باندھ دیا تھا۔ آخر میں لکھا تھا: "کیوں نہ تم کرسمس کی چھٹیوں میں آکر مجھ سے مل جاؤ اور سارے شہر کی رانی، ہند کی راجدھانی، دلّی کی سیر بھی کر جاؤ!"

میمونہ کا دل للچا اٹھا۔ کیا عجب وہاں اسے وہ تفریح، وہ خوشی میسر آجائے جس کی آرزو وہ عرصے سے دل میں دبائے ہوئے تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سفر سے اس کی زندگی میں کوئی اچنبھا، کوئی خوش گوار تغیر پیدا ہو جائے . . . . "

لمحہ ہی بھر میں اس نے دہلی جانے کا ارادہ کر لیا۔ سفر کے خرچ کے لیے اس کے پاس روپیہ موجود تھا ہی۔ نہ کسی رشتہ دار سے اجازت لینے کی ضرورت تھی نہ کوئی پابندی، اسی دن ساجدہ کو لکھ بھیجا کہ فلاں تاریخ، فلاں گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گی۔

چلنے سے ایک روز پہلے اس نے شہر جا کر کئی چیزیں خرید لیں۔ رومال، جرابیں، ریشمی

مفلر، اونچی ایڑی کا بوٹ، جڑاؤ کلپ جس پر تتلی بنی ہوئی تھی، نیل پالش، لپ اسٹک وغیرہ۔ علاوہ ازیں اس نے بہن کے لیے ملتان کے بنے ہوئے چاندی کے بندوں کی ایک جوڑی بھی خرید لی۔ ۲۲ر دسمبر کی شام کو اس نے اپنا سوٹ کیس، اٹیچی کیس اور بستر تانگے میں رکھوایا، اسکول کے بوڑھے چوکیدار کو ساتھ لیا کہ اسٹیشن تک پہنچا آئے، اور وہ روانہ ہوگئی۔

وہ گاڑی کے چلنے سے کافی پہلے آگئی تھی۔ اس لیے اسے زنانہ درجہ میں حسب منشا کھڑکی کے پاس جگہ مل گئی۔ وہ اکیلی تھی اور یہ اس کا پہلا ریل کا سفر تھا۔ اس پر بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اسے اس سفر سے ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسی بچوں کو ہوتی ہے۔

جب تک گاڑی روانہ نہ ہوئی وہ کھڑکی سے برابر پلیٹ فارم کی سیر دیکھتی رہی۔ مسافروں کا گٹھڑیاں اٹھائے بھاگنے، دوڑنا۔ عورتوں کا پیچھے پیچھے گھسٹتے آنا۔ قلیوں کی لڑائیاں، پلیٹ فارم کے نل پر مسافروں کا جمگھٹا، خوانچہ والوں کی صدائیں، متحرک دکانیں، یورپینوں کا سب سے الگ تھلگ ایسی بے فکری کی شان سے پھرنا گویا کوٹھی کے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں، اور ان سب کے پس منظر میں انجن کا رہ رہ کے بھانت بھانت کی آوازیں نکالتے رہنا۔ یہ سارا سماں میمونہ کے لیے انتہائی دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ علاوہ ازیں ایک ادھیڑ عمر کا ٹھنگنے قد کا موٹا سا گارڈ جس کی آنکھیں کوئلے کے ریزے پڑ پڑ کر دائمی طور پر سرخ ہوگئی تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے، سیاہ وردی پہنے سگار کے کش لگاتا، دھواں اڑاتا ایک چھوٹے سے انجن کی طرح بار بار اس کے ڈبے کے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سیدھا میمونہ کی کھڑکی کا رخ کیا مگر وہ رکا نہیں۔ بس اسے گھورتے ہوئے پاس سے نکل گیا۔ میمونہ اس کی یہ حرکات دیکھ دیکھ کر عجیب طفلانہ شوخی سے مسکراتی رہی۔

گاڑی چلتے چلتے وہ ڈبا عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ اس کے ڈبے میں تین چار لڑکیاں بہت شوخ تھیں۔ جنہوں نے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک خوب اودھم مچائے رکھا اور پھر تھک کر سوگئیں۔

اگلے روز وہ نئی دہلی میں اپنی بہن کے ہاں مقیم تھی۔ ساجدہ کی شادی کے بعد ان دونوں بہنوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ مگر اسے ساجدہ کی تیزی گفتار کا کمال کہیے کہ اس نے دو ہی گھنٹوں میں اپنی بہن کو پچھلے بارہ برس کے واقعات سے، ضروری اور غیر ضروری تفاصیل کے ساتھ، واقف کر دیا تھا۔ اس کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑی لڑکی کی عمر دس برس تھی۔ منجھلی کی سات برس اور چھوٹی بچی ابھی دودھ پیتی تھی۔ لڑکوں میں ایک کی عمر نو برس کی تھی، وہ چوتھی میں پڑھتا تھا۔ اور چھوٹا بیٹا چار سال کا تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ چند ہفتوں میں وہ پھر ماں بننے والی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہر ایک بچے کی پیدائش، اس موقع کے درد وکرب، ہسپتال کی نرسوں کی دوستی وغیرہ کا حال سنایا۔ ہر ایک بچے کی عادتیں، خصلتیں، ذہانت، شرارتیں، بیماریاں، جس جس شہر میں اس کے صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں رہنا پڑا تھا وہاں کی خصوصیات اور صاحب کی دفتری مصروفیتوں کا حال سنایا۔ آخر میں اس نے اداس لہجہ میں روپے کی قلت اور اپنی تنگ دستی کا ذکر کیا۔ اس کا میاں سو روپے پاتا تھا جو نئی دہلی کی رہائش، کھیل تماشوں، بچوں کی تعلیم وغیرہ کے اخراجات میں ہفتہ ہی بھر میں اٹھ جاتے تھے اور باقی سارا مہینہ حساب پر کٹتا تھا۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو۔ انہوں نے کسی دوست کو روپے قرض دے رکھے ہیں جو آج ہی کل میں ملنے والے ہیں۔ بس روپے ملتے ہی ہم ٹیکسی لیں گے اور تمہیں دلی کی سیر کرائیں گے۔"

جب دو دن گزر گئے اور ساجدہ کا میاں اپنے دوست سے روپے وصول کرنے میں

کامیاب نہ ہوسکا تو میمونہ نے بہن کے روکنے کے باوجود اپنے خرچ سے ٹیکسی منگوائی اور اس میں دونوں بہنیں، میمونہ کا بہنوئی اور پانچوں بچے لد کے دہلی کے قابلِ دید مقامات دیکھنے گئے۔ مگر بچوں کے غل غپاڑے اور ان کی دیکھ بھال میں میمونہ کو سیر کا کچھ لطف نہ آیا اور وہ نہایت بددل ہوکر واپس آئی۔

اگلے روز شام کو اسے اداس دیکھ کر ساجدہ نے اپنے صاحب سے کہا:

"تم جانتے ہو، میں تو پیدل چل نہیں سکتی، تم جا کے ذرا میمونہ کو کناٹ پلیس کی سیر تو کرا لاؤ۔"

اس نے بادلِ نخواستہ حامی بھر لی۔ وہ پینتیس چھتیس برس کا دُبلا پتلا نوجوان تھا، ایک بے چین روح۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت ایک تشنگی اور وحشت سی جھلکتی رہتی تھی۔ وہ خاصا خوش شکل تھا مگر اپنی ناداری کی وجہ سے اپنی سالی کے سامنے کچھ جھینپا جھینپا سا رہتا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے تنہائی میں اپنی بیوی کو ملامت بھی کی تھی کہ ایسی تنگدستی کی حالت میں تم نے اسے بلوایا ہی کیوں۔ جس وقت وہ روانہ ہونے لگے تو ساجدہ نے احتیاط کے طور پر اپنی بڑی بیٹی قمر النساء کو بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

سردی خاصی پڑنے لگی تھی۔ میمونہ نے ساری کے اوپر اوورکوٹ پہن لیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ چہل قدمی کرتے ہوئے کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ یہاں کی رفیع الشان عمارتیں، فلیٹوں میں رہنے والی مخلوق، دکانوں کی سج دھج اور ان کی جھلملاتی ہوئی رنگا رنگ روشنیاں، مشرقی اور مغربی آرٹ کے نمونے، سینما گھروں کی گہما گہمی، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بلند ہونے والے قہقہے، پارکوں میں کہیں اجالا کہیں اندھیرا اور کہیں نور اور سایہ باہم گتھے ہوئے، اور سب سے بڑھ کر یہاں کے خوش پوش نوجوانوں اور نارنگی ساریوں والی لڑکیوں کے جھرمٹ۔ جدھر سے یہ جھرمٹ گزر جاتے فضا جوانی کے نشہ سے

حک اٹھتی۔ میمونہ ان سب چیزوں کو ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ دہلی آنے پر اُسے جو کوفت ہوئی تھی اس کا خیال ایک دم دل سے نکل گیا تھا۔ لڑکیوں کو کسی مرد کی سرپرستی کے بغیر آزادانہ اور دلیری سے پھرتے دیکھ کر اسے تعجب بھی ہُوا اور خوشی بھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر گھما پھرا کر اس کا بہنوئی اسے ایک جگمگاتے ہوئے قہوہ خانے میں لے گیا جس کی بڑی صفت یہ تھی کہ وہاں چیزوں کے دام بہت کم لیے جاتے تھے۔ یہ قہوہ خانہ اعلیٰ درجہ کے فرنیچر سے مزین تھا اور اتنا فراخ کہ پچاس ساٹھ آدمی بیک وقت اس میں سما سکیں۔ جس وقت وہ اپنی سالی اور بیٹی کو لے کر اندر پہنچا تو یہ قہوہ خانہ گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ ایک کونے میں ایک میز کو خالی دیکھ کر وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ جما لیا۔

تھوڑی دیر میں قہوہ آ گیا۔ میمونہ نے اس کی چسکیاں لینا اور اپنے اردگرد دیکھنا شروع کیا۔ ہندوستانی اینگلو انڈین اور یورپین مرد و زن بڑھیا سے بڑھیا لباس پہنے مزے مزے سے قہوہ پی رہے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ وہ جوں جوں انہیں دیکھتی گئی اس کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ جب وہ قہوہ پی چکے تو اس کا بہنوئی ایک دوست کو ٹیلی فون کا بہانہ کرکے کونٹر کے پاس گیا اور چپکے سے بل بھی ادا کر آیا۔ چونکہ انہیں گھر سے نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے اس لیے یہاں سے نکل کر انہوں نے سیدھا گھر کا رُخ کیا۔

جب وہ گھر پہنچے تو ساجدہ نے بہن سے پوچھا:

"کیوں پسند آیا کناٹ پلیس ؟"

"ہاں" میمونہ نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا "بہت دلچسپ مقام ہے"

دوسرے دن شام کو ساجدہ کے میاں کو کوئی کام تھا اور وہ سرِ شام ہی سے گھر سے نکل گیا۔ اُدھر میمونہ بناؤ سنگھار کرکے اور نئی ساری پہن کے تیار ہو گئی۔ ساجدہ نے پوچھا:

"کہاں کی تیاری ہے ؟"
" ذرا گھومنے جاؤں گی ۔"
" ابھی اکیلی ؟"
" اور کیا اکیلی کو کوئی پکڑ لے گا ؟"
قبل اس کے کہ ساجدہ آج پھر اپنی بڑی بیٹی یا بیٹے کو ہمراہ لے جانے کی ہدایت کرتی وہ کواڑ سے باہر تھی۔
کناٹ پلیس پہنچ کر اس نے پارک کا رُخ کیا جس کے بیچوں بیچ ایک گول چبوترے پر پولیس کا بینڈ بج رہا تھا اور سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے اس کے گرد جمع تھے۔ تھوڑی دیر وہاں کی چہل پہل دیکھنے کے بعد جب وہ دکانوں کی طرف لوٹ رہی تھی تو اس نے محسوس کیا جیسے کوئی شخص اس کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو یہ ایک پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا جس نے سبز فیلٹ ہیٹ اور فاختئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لمبا قد، گورا چٹا رنگ، پتلی پتلی ترشی ہوئی مونچھیں، لمبی لمبی قلمیں، آنکھوں سے علم کا نور اور چال سے شائستگی ٹپکتی تھی۔ وہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا۔ مگر تھوڑی ہی دور چل کے اس نے ایک دم اپنی رفتار سست کر دی اور اب کے میمونہ کو اس کے پاس سے گزرنا پڑا۔
اب وہ اس چوراہے میں پہنچ گئی تھی جہاں سے دکانوں کی قطاریں داہنے بائیں ایک دائرے کی صورت میں گئی تھیں۔ میمونہ ایک قطار کی طرف زیادہ روشنی دیکھ کر چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نوجوان بھی اسی سمت آتا دکھائی دیا۔ اب کے اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میمونہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نوجوان کچھ دور تک تو اس کے پیچھے پیچھے رہا اور پھر تیزی سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اب کے

اس نے اپنی نظریں میمونہ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ چند قدم چل کر وہ ایک بک سٹال پر ٹھہر گیا اور اخباروں کی سرخیاں پڑھنے لگا۔ میمونہ کو پھر اس کے پاس سے گزرنا پڑا۔

یہ ماجرا کئی بار پیش آیا کہ کبھی تو وہ نوجوان اس کے آگے آگے چلنے لگتا اور کبھی میمونہ کو اس کے آگے آگے چلنا پڑتا۔ اس نے سوچا، ذرا دیکھوں تو یہ نوجوان سچ مچ میرا پیچھا کر رہا ہے یا یہ میرا وہم ہی وہم ہے۔

وہ ایک چینی آرٹ کی دکان میں داخل ہو گئی اور وقت گزارنے کے لیے چینیوں کی بنائی ہوئی تصویریں، کھلونے، ظروف اور کپڑے وغیرہ دیکھنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد جب وہ دکان سے نکلی تو وہ نوجوان باہر اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تھیں کہ اس نوجوان نے ہیٹ کے کنارے کو چھو کر سر کی ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سلام کیا۔

یہ حرکت اس سے ایسی غیر متوقع طور پر سرزد ہوئی تھی کہ میمونہ بے ساختہ مسکرا دی۔ اس کے بعد اس نے کناٹ پلیس کے دو تین چکر اور لگائے اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران میں وہ نوجوان بدستور اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب اس کے بہنوئی کا کوارٹر چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے اچانک پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور ایک اندازِ شوخی سے بھاگ کر کوارٹر میں چلی گئی۔

ساجدہ اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی:

"شکر ہے تم آ گئیں۔ مجھے بڑا فکر ہو رہا تھا۔ کہو کہاں کہاں گھوم آئیں؟"

"یہیں کناٹ پلیس تک گئی تھی۔"

"عورت ذات، پھر تنہا، پھر ناواقف، فکر کی بات ہی تھی . . . . تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

"نہیں تو" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس رات اس نے خوشی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وہ دیر تک بچوں سے باتیں کرتی رہی۔ آج بچے اسے یکایک دلچسپ معلوم ہونے لگے تھے۔ اس نے چھوٹی بچی کو گود میں لیا، پیار کیا، پھر آہستہ آہستہ اسے ہوا میں اچھالنے لگی۔ کمرہ قلقاریوں سے گونج اٹھا۔

اگلے روز سہ پہر ہی سے اس نے بناؤ سنگار شروع کر دیا۔ اپنی سب سے بڑھیا ساری نکالی جو اس کی ایک امیر شاگرد کی ماں نے اپنی بیٹی کے پاس ہونے کی خوشی میں اسے تحفے میں دی تھی۔

کوارٹر سے نکل کر وہ سیدھی اس سیلون میں پہنچی جہاں بجلی کے ذریعے بالوں میں لہریں پیدا کی جاتی تھیں۔ یہ انگریزی دکان اس نے کل کے گشت میں دیکھ لی تھی۔ جب اس کے گھنے بالوں میں لہریں پڑ چکیں اور تازہ ترین مغربی فیشن کے مطابق ان کی آرائش ہو چکی تو وہ آیئنے میں پہلے پہل اپنی صورت پہچان نہ سکی۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ اصلی عمر سے آٹھ برس کم۔ اس کے پیچھے اس سیلون کی بوڑھی شاطہ جو ایک فرانسیسی خاتون تھی اسے ایسی شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے ماں اپنی دلہن بیٹی کو سنگار کے بعد دیکھتی ہے۔

شام کے جھٹپٹے میں ہیمونا اپنی خوشی کو دبائے جھینپتی ہوئی سیلون سے نکلی اور کناٹ پلیس کے پارک کی طرف ہولی۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر تک پارک کے مختلف حصوں میں پھرتی رہی۔ پھر اس نے دکانوں کا گشت لگانا شروع کیا۔ مگر وہ کل والا نوجوان اسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اس قہوہ خانے کے پاس پہنچی جہاں وہ پہلے روز اپنے بہنوئی کے ساتھ گئی تھی۔ قہوہ خانہ آج بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسے اندر جاتے کچھ جھجک سی معلوم ہوئی مگر اس نے دل کو مضبوط کیا اور

کسی کی طرف دیکھے بغیر اندر جاکر ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گئی اور ملازم سے قہوہ منگوایا۔

رفتہ رفتہ اس نے کنکھیوں سے اپنے آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی محفلیں منعقد تھیں۔ کہیں اہم ملکی معاملات پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی تو کہیں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی۔ ایک کونے میں دو بنگالی لڑکیاں جن کی چوٹیوں کے سروں میں سُرخ سُرخ ربن بندھے ہوئے تھے۔ سر سے سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دوسری میز پر ایک نوجوان بظاہر اخبار میں منہمک معلوم ہوتا تھا مگر در اصل وہ ان لڑکیوں کو گھور رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر وہ سبز فیلٹ ہیٹ اور فاختئی رنگ کے سوٹ والا نوجوان کہیں نہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ قہوہ خانے سے نکل آئی۔ اس وقت خاصی رات ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے مفلر کو اپنے گلے کے گرد لپیٹ کر اوورکوٹ کے بٹن بند کر لیئے۔ اور سپر د کانوں کی طرف چل دی۔

جیسے ہی وہ چوراہے کے پاس پہنچی اس نے دیکھا کہ ایک سڑک کے درمیان جہاں موٹریں وغیرہ ٹھہرائی جاتی ہیں، ایک سیاہ سیلون کار کھڑی ہے۔ اس میں دو تین نوجوان، انگریزی سوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور دو تین باہر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ ذرا قریب پہنچی تو اس جتھے میں اسے وہ کل والا نوجوان نظر آ گیا۔ آج اس نے جیسٹر پہن رکھا تھا اور سر سے ننگا تھا۔ وہ موٹر کے دروازے کے پاس کھڑا اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا جسے وہ سر جوڑے غور سے سن رہے تھے۔ جیسے ہی اس نوجوان کی نظر میمونہ پر پڑی وہ گھبرا سا گیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو چشمہ لگائے پاس ہی کھڑا تھا کہنی سے ٹہوکے دینے لگا۔ یک بارگی سب کے چہرے اشتیاق

سے چمک اٹھے۔ مگر بظاہر انہوں نے میمونہ کی طرف توجہ نہ کی اور ایک بے پروائی کا سا انداز اختیار کئے آپس ہی میں باتیں کرتے رہے۔

میمونہ نے ان کی یہ سب حرکات بھانپ لی تھیں۔ اس کا چہرہ یک لخت تمتما اٹھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں حقارت سے کہہ اٹھی:

"اوہ یہ بات تھی!"

جب وہ ذرا دُور نکل گئی تو وہ نوجوان اپنے ساتھیوں سے جدا ہوا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دکانوں کی قطار کے اس سرے کی طرف چل دیا جس طرف میمونہ جا رہی تھی۔ سرے پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور جیب سے سگریٹ نکال سلگانے لگا۔

میمونہ نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ آج اس کا انداز کل سے بالکل بدلا ہوا تھا۔ کل وہ بہت خوفزدہ اور اداس معلوم ہوتا تھا مگر آج اس کی آنکھوں میں شوخی اور بے باکی تھی۔ میمونہ کا گزشتہ شب اپنے کوارٹر کے سامنے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنا، مسکرانا اور بھاگ جانا اسے دلیر بنانے کے لیے کافی تھا۔ اور پھر آج کا یہ سنگار، بالوں میں یہ لہریں، زلفوں میں یہ پیچ و خم۔۔۔۔۔۔

میمونہ کو آج اس نوجوان کے چہرے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے اس کے اور لفنگے ساتھیوں کے چہرے جن پر ایک جیسی عیاری، ہوس کاری، بازاری پن اور بے وقوفی برس رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ کل وہ اسے کیوں بھا گیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کے پاس سے گزرے گی تو وہ ضرور کوئی حرکت کرے گا کچھ نہیں تو کوئی فقرہ ہی کسے گا۔ مگر اس نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ جب اس کے اور ان کے درمیان کوئی بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ ایک دکان کے شوکیس میں چھوٹے موٹے لیسوں اور فیتوں کے نمونے دیکھنے ٹھہر گئی اور پل بھر کے بعد وہ جس طرف سے آئی تھی

اسی طرف لوٹ گئی۔ چند ہی قدم چلی تھی کہ اسے سامنے سے سڑک پر وہی سیاہ سیلون کار آتی دکھائی دی۔ اس میں اس وقت چار آدمی سوار تھے۔ انہوں نے ایسی نظروں سے اسے گھورا کہ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ بلاشبہ یہ کار ہلکی رفتار سے ساتھ ساتھ سڑک پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

طرح طرح کے وحشت ناک خیال اس کے دل میں آنے لگے جو اسے سہمائے دیتے تھے وہ رہ رہ کے اپنی کل کی حرکتوں پر اپنے کو ملامت کر رہی تھی۔ پردیس کا معاملہ تھا۔ عزت کا خدا ہی نگہبان تھا۔

سامنے سے ایک انگریز انسپکٹر کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی اس نے دل کو مضبوط کیا اور یہ سوچ کر تسلی دی کہ جب تک میں خود موقع نہ دوں گی ان کتوں کی مجال نہیں کہ میرے قریب بھی پھٹکنے پائیں۔

جب تک وہ دکانوں کے آگے کے لمبے محراب دار برآمدے میں گزرتی رہی نوجوان نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح وہ اسے اپنی طرف متوجہ کریں وہ اس کے کبھی آگے آگے، کبھی پیچھے پیچھے، کبھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مگر میمونہ نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ ایک جگہ کونے میں دو بڑے بڑے گول ستونوں کے درمیان ایک تنگ موڑ تھا جس میں سے ایک وقت میں صرف دو ایک آدمی ہی گزر سکتے تھے۔ جب وہ ان ستونوں میں سے گزرنے لگی تو دیکھا کہ نوجوان اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس وقت اتفاق سے اور کوئی آدمی آس پاس نہیں تھا۔ میمونہ لمحہ بھر کے لیے رک گئی اور منتظر رہی کہ وہ ہٹے تو گزروں۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس پر یکبارگی اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جیسی اسکول میں کسی ضدی اور سرکش دیہاتی لڑکی کی ہٹ دھرمی پر ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انتہائی غیظ برسنے لگا اور اس نے حقارت

سے تحکمانہ لہجے میں بولی:

"ہٹو راستہ چھوڑو۔ بے وقوف آدمی!"

وہ نوجوان دبک کر ایک طرف ہو گیا۔

اس وقت آٹھ بج چکے تھے اور وہ کناٹ پلیس کے چکر سے نکل کر اس بڑی سڑک پر پہنچ گئی تھی جو سیدھی اس کے بہنوئی کے کوارٹر کو جاتی تھی۔ ادھر شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نوجوان نے زیادہ سرگرمی سے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب آس پاس کوئی نہ ہوتا تو وہ زور زور سے آہیں بھرنے لگتا۔ دو ایک دفعہ اس نے عاشقانہ اشعار بھی گنگنائے۔ مگر میمونہ نے رسید تک نہ دی۔ اس پر وہ کھلم کھلا اسے بازاری خطابوں سے پکارنے لگا۔ میمونہ نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جب وہ ایک چوک میں سے گزر رہی تھی تو وہ سیاہ رنگ موٹر فراٹے بھرتی ہوئی بالکل اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اگر وہ جلدی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتی تو عجب نہ تھا کہ اس کی ٹانگ موٹر کے پہیے کے نیچے آ جاتی۔ ادھر وہ ہٹی، ادھر موٹر میں سے آواز آئی:

"اوہ، ویری سوری!"

میمونہ نے اب سنبھل کر اور سڑک کے بالکل کنارے ہو کر پھر تیز رفتار سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ ادھر وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا عاشقانہ فقرے کستا اور آہیں بھرتا چلا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر چکر کاٹ کر پھر اس کے پاس سے گزر گئی۔ اب کے اس کے کان کے پاس اس زور کا ہارن بجا کہ وہ ڈر کر اچھل پڑی۔ موٹر میں سے آواز آئی:

"پیدل کب تک چلیے گا، موٹر میں تشریف لے آئیے نا سرکار!"

میمونہ کا کوارٹر اب صرف ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ جوں جوں اس کا گھر قریب آتا جاتا تھا نوجوان کی آہ و فغاں میں زیادہ سے زیادہ جوش وخروش پیدا ہوتا جاتا تھا۔ میمونہ نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور بھی تیز۔ یہاں تک کہ وہ قریب قریب دوڑنے لگی۔ اس کے پیچھے لگاتار ایک شور سنائی دیتا رہا مگر اس نے بالکل دھیان نہ دیا، نہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ آنے دی آخر کار وہ اپنے کوارٹر میں پہنچ ہی گئی۔

ساجدہ نے اسے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھا تو پوچھا :

"تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو ؟ دم کیوں چڑھا ہُوا ہے ؟"

"نہیں تو" میمونہ نے مری ہوئی آواز میں کہا اور اپنے جسم کو ایک آرام کرسی پر گرا دیا۔

اس رات خاصی دیر تک رہ رہ کے اس کے کوارٹر کے سامنے ہارن بجتا رہا مگر میمونہ نے اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہے۔

۱۴ر دسمبر کی شام کو وہ دہلی کے اسٹیشن پر ریل کے زنانہ درجے میں بیٹھی واپس جا رہی تھی۔ اس کے منی بیگ میں صرف چند روپے اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔ سو روپے کے یوں بیکار مصرف اٹھ جانے پر اس کا دل بھر بھر آتا تھا۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ اس کا کوئی زیور بنا لیتی جو آڑے وقت میں اس کے کام بھی آتا . . . . .

وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی ہر چیز کو بڑی بے توجہی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پانچ برس اور بوڑھی ہو گئی ہو۔

۱۹۴۰ء

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن، جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت و بلاغت سے تقریر کر رہے تھے۔

"۔۔۔۔۔ اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"۔۔۔۔ اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم، جو درسگاہوں

میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربکار جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے سموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پر اسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا کر دیتا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے، بول اٹھے:

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے، جو چشمہ لگائے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دَور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے

بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ حیاتِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن، جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہاہا ہا ہو ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔ . . ."

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے، جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو

دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے ہیں اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے: "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لیے باعثِ صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے: "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے: "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے۔ اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے: "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا: "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں، سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس کے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں سو رنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ، جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی، منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر صاحب معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے، مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا،

سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان میسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا۔ اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی، وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے! شہد سے میٹھے خربوزے" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آموجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آجاتا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپّر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروبِ آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کر، کے

مصداق، شہر سے پیدل چل کر، بیسواؤں کی اس نئی لبستی کی سُن گُن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذراہٹ کر ان کے گردا گرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

لبستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج، مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے!" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔ شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا۔

اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے "اللہ ہو" کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگِ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرشِ زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس، جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی

چادر چڑھائی گئی، اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔
شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پاندان، پیک دان، پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دُور دُور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رُخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بےشمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے، اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے، اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں لسبی ہوئی نازنینیں اٹھکھیلیوں سے چلتیں۔ رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔
دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں سازوسامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصّہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے

بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جائیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی میں جگمگا اٹھتے جو جابجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے۔ اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے، ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دُور جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر۔ رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز، قلقلِ مینا میں مل کر، ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لاتے اور اسے منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔

بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آبسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ، ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے، سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک

رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رُخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایے سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لیے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان

اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی کرا اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا، اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آجاتے اور دیر تک بُت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستارنواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رُخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستارنواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاّجی، جب تک تو یہ بستی زیرِ تعمیر رہی، رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب کہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملاّجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیسٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی

کا رُخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت ومشقت کی کسر شور وغل، حرمستیوں اور ادنیٰ اعیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ، چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیاسوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوتے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو"۔ شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے، اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں

بیٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق جوق اس پُراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیسواؤں کے ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلّوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر

کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آآکر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیا ڈالے، 'دل پسند دل بہار مالش' کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آرہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر

چڑھاتے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔ . . . .

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی سکول، ایک لڑکوں کے لیے ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری سکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حُسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسَن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ

عوام حُسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے " آنندی! "

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں: " معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ . . . "

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دُور تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء

یہ کتاب

غلام عباس کے افسانے سب اردو افسانوں سے نرالے ہیں ۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا ترجمہ کسی یورپین زبان میں ہو جائے تو اور ملکوں کے لوگ بھی انہیں پڑھ کر لطف پائیں ۔ انہیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہمارے گرد و پیش کئی ایسی دلچسپیاں تھیں جو **غلام عباس** کے بغیر آج تک نظر نہ آئی تھیں اور جن کی بدولت اب زندگی کے بعض بے کیف گوشے بھی رنگین نظر آتے ہیں ۔

پطرس

غلام عباس کا فن متنوع اور ہمہ گیر ہے ؛ ان کے کرداروں میں بڑی رنگا رنگی ہے ؛ انہیں بیان کی باریکیوں اور پیچیدگیوں پر ایسی دسترس ہے کہ اردو میں کمیاب ہے ؛ ان کے انداز میں بڑی متانت اور ٹھہراؤ ہے ؛ ان کے یہاں سادگی کے ساتھ ساتھ پرکاری بھی ہوتی ہے ۔ **غلام عباس** کے افسانے اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں ۔

محمد حسن عسکری

مکتبۂ جدید